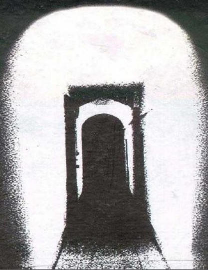
محمد عاصم بٹ

دستک

(کہانیاں)



دستک

اور دوسری کہانیاں

محمد عاصم بٹ

شہرزاد، کراچی

ترتیب

آخری فیصلہ

''میں رشید احمد ولد نذیر چوہدری سکنہ قصور یہ تحریر بقائمی ہوش حواس رقم کر رہا ہوں۔ اس میں لکھا ہوا ایک ایک لفظ میرا سچ ہے۔ اسے کسی طرح کے ذہنی اختلال یا جور و جبر کی پیداوار نہ سمجھا جائے۔

آج نومبر کی 10 تاریخ ہے۔ موسم سرد ہے۔ رات کے بارہ بج کر کچھ منٹ ہوئے ہیں۔ میرے عقب میں دیوار پر ٹنگی گھڑی میں ابھی کچھ دیر پہلے، کوئی دو تین منٹ پہلے ہی بارہ کا الارم بجا تھا۔ میں گھر میں اکیلا ہوں۔ بیوی بچوں کے ساتھ اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔ دو چار دن یہاں سکون رہے گا۔ ان چند خاموش دنوں میں، جن سے میں زندگی کا بیشتر عرصہ محروم رہا ہوں، میں وہ سارے کام اطمینان کے ساتھ کر پاؤں گا جن کی منصوبہ بندی ایک عرصہ سے میرے ذہن میں خود بخود پروان چڑھتی رہی ہے۔ اصل مدعا کی طرف آنے سے پہلے کیوں نہ میں کچھ اپنا تعارف کروا دوں۔ تھوڑا بہت جیسا بھی ممکن ہو سکے۔ یونہی بس چیدہ چیدہ باتیں۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں میرا نام رشید احمد ہے۔ ذات کا چودھری ہوں لیکن نام کے ساتھ نہیں لکھتا۔ صرف میٹرک کی سند واحد سرکاری دستاویز ہے جس پر میرا نام چودھری رشید احمد لکھا ہے۔ وہ بھی والدین بلکہ والد صاحب نے خود لکھوایا تھا۔ برتھ سرٹیفکیٹ تو شاید کبھی بنایا ہی نہیں گیا۔ دیہاتوں میں اس کا رواج نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اپنے طور پر میں نے کبھی اپنا نام، اپنی ذات کے لاحقے کے ساتھ نہ بتایا نہ لکھا۔ دیہات میں یہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن شہر میں گنگا کچھ اور طرح بہتی ہے۔ چودھری یا کوئی بھی ایسا حوالہ جس سے دیہات سے میرے تعلق کا بھید کھلتا ہو، مجھے پسند نہیں ہے۔

میں سرکاری ملازم ہوں۔ LDA کے شعبہ حسابات میں سینئر کلرک کے طور پر کام کرتا ہوں۔ جہاں میں بیٹھتا ہوں، وہ ایک پانچ منزلہ دیوہیکل عمارت ہے جو بہت چوڑی اور دور سے اپنی لمبوتری صورت کی وجہ سے کسی چٹان یا ایسے ڈائنو سار کی مانند معلوم ہوتی ہے جو آسمان کی طرف منہ کیے بیٹھا ہو۔ اس عمارت کی تیسری منزل میں کمرہ نمبر C-33 میں داخل ہوں تو آپ کو دروازے والی دیوار کے علاوہ باقی تینوں دیواروں کے برابر ایک ایک کرسی اور میز پڑی دکھائی دے گی۔ انہیں میں سے ایک کرسی اور میز میری بھی ہے۔ وہی جو کھڑکی والی دیوار کے برابر پڑی ہے۔ ان کرسیوں اور میزوں کے علاوہ کمرے میں چند مزید کرسیاں، بوسیدہ اور گھن زدہ فائلوں سے اٹی ہوئی الماریاں، دو ائیر کولر، ٹائپ رائٹر اور ایسا ہی کچھ دفتری سامان پڑا دکھائی دے گا۔

جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں باہر سے یہ عمارت بہت عالیشان معلوم ہوتی ہے۔ اسے بنے عرصہ ہی کتنا ہوا ہے، تین ایک سال بھی نہیں۔ پہلے تمام دفاتر مون مارکیٹ میں ایک کرایے کی عمارت میں تھے۔ ابھی یہ عمارت مکمل طور پر تیار بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس میں منتقل ہو گئے۔ عمارت تو نئی تھی لیکن ملازمین اور ان کے ساتھ آنے والا ساز و سامان تو وہی تھا، برس ہا برس پرانا، گھن لگا۔ ملازموں سے کہیں زیادہ سامان پرانا تھا اور

سامان سے کہیں زیادہ دفتر کا سسٹم۔ سامان چاہے بدل ڈالو، ملازمین نئے بھرتی کر لو۔ حتیٰ کہ کم کم بدلنے والا دفتر کا نام تک بدل لو۔ لیکن اگر نہیں بدلتا تو وہ ہے دفتر کا سسٹم۔ ایک سست رو، پیچ دار اور پر اسرار سسٹم۔

اس سسٹم میں کام کرتے ہوئے مجھے پندرہ برس ہو گئے ہیں۔ تب میری عمر یہی کوئی بیس بائیس برس رہی ہوگی۔ نیا نیا گریجوایٹ بنا تھا۔ میری عمر کے ہر نوجوان کی طرح میرے بھی کچھ خواب تھے، نازک سے، رنگین اور خوبصورت خواب۔ جو میرے طبقے کے دوسرے نوجوانوں کے خوابوں کی طرح ان پندرہ برسوں میں آہستہ آہستہ مگر بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئے۔ اب خواب باقی نہیں رہے تھے۔ ان کی تلچھٹ رہ گئی تھی، نم ناک حسرتوں کی صورت میں۔ اچھی نوکری اور اچھی چھوکری۔ یہی تو خواب ہوتے ہیں ہم جیسے لوئر مڈل کلاسیوں کے۔ نوکری اور چھوکری تو ملی۔ میرا مقدر میرے طبقے کے اجتماعی مقدر سے جدا نہیں تھا مگر میرا ذہن اس اجتماعی سوچ کا حصہ نہیں بن سکا جو میرے طبقے سے متصف ہے۔ نہ نوکری میرے معیار پر پوری اتری اور نہ بیوی سے ہی کبھی کوئی قربت بھرا تعلق قائم ہو سکا۔ اس زمانے میں بھی نہیں جب میاں بیوی کے تعلق کے سبھی تار جنس سے جڑے ہوتے ہیں۔ یہ تار جڑے ضرور تھے اور ان میں اتنا تناؤ اور بھراؤ بھی تھا کہ ذرا سا چھیڑ جاتے تو جلترنگ سا بجنے لگتا۔ لیکن یہ نغمہ بے روح رہا۔ یہ موسیقی بے رس تھی۔ میں اپنے حال سے ناخوش رہا، مستقبل کے بارے میں شاکی اور ماضی پر نادم۔ جیسے میں کوئی ایسا بھاگی بھگت تھا جسے دیوتاؤں نے کسی غلط فہمی کی بناء پر بے قصور ہی شراپ دیا ہو۔ میرا المیہ یہ تھا کہ میں کلرک ہونے کے باوجود کبھی ٹھیک سے ایک کلرک کی طرح نہیں سوچ پایا۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔ میں یہاں بیٹھا یہ تحریر نہ لکھ رہا ہوتا۔ میرے حالات کبھی اس نہج پر نہ پہنچتے کہ مجھے کوئی آخری فیصلہ کرنا پڑتا جیسا میں اب کر چکا ہوں۔

پندرہ سال پہلے میں اسی شعبہ حسابات میں جونیئر کلرک کی حیثیت سے بھرتی ہوا تھا۔ میں گریجوایٹ تھا جبکہ اسامی کے لیے انٹر پاس مانگے گئے تھے۔ مجھے اعتماد تھا کہ میرا انتخاب ہو جائے گا۔ شاید اپنے آپ پر یہ بات ثابت کرنے کے لیے ہی میں نے درخواست دی۔ انٹرویو ہوا اور مجھے تقرری کا پروانہ مل گیا۔ کرنے کو کوئی اور کام نہیں تھا سو یونہی وقت گزاری کے لیے دفتر جانے لگا۔ صبح دفتر جاتا، شام کو دوستوں کے ساتھ مٹر گشت کرتا۔ آہستہ آہستہ مجھے کانوں کان خبر نہ ہوئی اور یہ سب کچھ معمول بن گیا۔ میں اس نئی زندگی کا عادی ہو گیا۔

مجھے تصویریں بنانے کا شوق تھا۔ میں مصور بننا چاہتا تھا۔ ڈرائنگ میں ہمیشہ میرے نمبر اچھے ہوتے۔ ایف اے میں فائن آرٹس کا مضمون صرف اسی نیت سے رکھا کہ آگے کسی آرٹس کالج میں داخلہ لوں گا۔ لیکن اس پر کتنا خرچہ اٹھے گا، اس کا اندازہ مجھے تبھی ہو گیا جب ایف اے میں فائن آرٹس کے پریکٹیکل کے لیے ادھار مانگ کر قیمتی رنگ، برش اور کینوس وغیرہ خریدے۔ ایف اے کے بعد خاموشی سے بی اے میں داخلہ لیا اور جیسے تیسے اپنے طور پر تصویریں بنانے کا شوق پورا کرتا رہا۔ لیکن جوں جوں زندگی کے ماہ و سال گزرتے رہے، میرے پاس ایسے کاموں کے علاوہ جن میں سے بیشتر میرے لیے خوشگوار نہیں تھے، دوسرے مشاغل کے لیے وقت کم ہوتا گیا۔

نوکری کے پندرہ برسوں میں میری سینئر کلرک کے درجے میں ترقی ہوئی۔ تنخواہ بھی معمولی سی بڑھی۔ ان تمام سالوں میں ہیڈ کلرک بننے کے لیے میں نے کتنے ہی جتن کر مارے۔ بار بار درخواستیں دیں۔ یہ آسامی کئی سالوں سے خالی پڑی تھی۔ آخر کسی نہ کسی کو تو یہاں آنا ہی تھا۔ لیکن میری درخواستیں فائلوں کے انبار تلے دب کر رہ گئیں۔ میری کاوشیں بے سود رہیں۔ میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ اتنے جوگا ہوتا تو اول ایسی نوبت ہی

کیوں آتی کہ میں ہیڈ کلرک کی آسامی پر ترقی کے انتظار میں بیٹھا رہتا۔ اس سے بہت پہلے کسی اور حیثیت میں ترقی کر چکا ہوتا۔ میں ویسا ہوتا تو تمام عمر اسی پشیمانی میں کیوں گزار دیتا کہ ویسا ہوتا تو یہ کرتا، ویسا ہوتا تو وہ کرتا۔

نوکر ہونے کے بعد دس سال تک میں اپنی تینوں بہنوں کو بیاہنے کے لیے جمع جوڑ کرتا رہا۔ انہیں وداع کیا تو ماں باپ نے مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے سے کچھ ہی عرصہ قبل میری بھی شادی کر دی۔ تھوڑی سی دیر اور ہو جاتی تو اس جھنجھٹ میں پڑنے سے ہمیشہ کے لیے بچ جاتا۔ لیکن میں پھنس گیا۔ میری بیوی بس ٹھیک ہی ہے۔ جیسی ہم جیسے کلرکوں کی بیویاں ہوتی ہیں۔ واجبی سی شکل وصورت ہے۔ کچھ بے ڈھنگی سی، کچھ چڑچڑی، کچھ کچھ گوارا اور کچھ کچھ ناگوارا۔ سگھڑ البتہ بہت ہے۔ امور خانہ داری میں کسی ماہر کاریگر کی طرح طاق ہے۔ بچوں کی پرورش بھی اس نے ٹھیک ہی کی۔

رضیہ نے مجھے تین بچے دیے۔ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں۔ سب سے بڑی کلثوم ہے۔ پھر رابعہ ہوئی اور آخر میں ذیشان۔ بیوی کو بیٹے کی خواہش تھی۔ مجھے تو خیر بیٹی کی بھی نہیں تھی۔ شروع میں خاصی منصوبہ بندی کی کوشش کی لیکن کلثوم ہو ہی گئی۔ پھر ایسے ہی جھٹکے میں رابعہ ہوئی۔ اس کے بعد میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ مجھے لگا زندگی کا بہاؤ آخری حد تک میری گرفت سے نکل چکا تھا۔ بہتر زندگی گزارنے کی خواہش جو کلثوم کی پیدائش کے بعد کچھ کچھ باقی رہی تھی، رابعہ کے آنے سے اپنی موت آپ مرگئی۔ اب تو جیسی بھی گزرے، بس گزر جائے۔ یونہی رینگتے رینگتے، سسکتے، بلبلاتے۔ پھر جب بیوی نے بیٹے کی آس میں تیسرے بچے کے لیے ضد کی تو میں نے ذرا بھی مخالفت نہیں کی۔ بلکہ سوچا یہ اچھا ہی ہوگا۔ یہ جو بجھی ہوئی راکھ میں کبھی کبھار کوئی چنگاری سی بھڑک اٹھتی ہے، یہ بچہ آزادی کے اس آخری امکان کو بھی ختم کر دے گا۔ بہت اطمینان ہو جائے گا اس کے بعد۔ اور کچھ ایسا ہی ہوا۔ میں اپنے حال پر قانع ہو گیا، کسی بھی اچھے کلرک کی طرح۔ اور تھوڑی سی تنخواہ کو اپنے وسائل کی آخری حد مان کر بہتر زندگی کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔ تین بچے، ڈیڑھ منزلہ مکان، بیوی اور سرکاری نوکری، بس یہی کل متاع تھی۔ لیکن شاید راکھ کے اندر پھر بھی کہیں کوئی ایک چنگاری رہ گئی تھی جو ہولے ہولے سلگتی رہی۔ بس ایک دن یہی چنگاری جوالہ مکھی بن کر بھڑکی اور سب کچھ فنا ہو گیا۔

میرے بچے سرکاری سکول میں پڑھتے ہیں۔ میں روزانہ انہیں سکول چھوڑتا ہوا دفتر جاتا ہوں۔ میرے راستے میں بہت سے پلازے، گلیاں، بازار اور سڑکیں آتی ہیں۔ ایک ایسی ہی چوڑی سڑک کے پار میرے دفتر کی عمارت ہے۔ زیبرا کراسنگ تک پہنچنے کے لیے، جہاں سے میں سڑک پار کرتا ہوں، مجھے کچھ فاصلے تک سڑک کے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ یہ بڑی پر ہجوم سڑک ہے۔ صبح کے وقت تو خاص طور پر یہ ہر برانڈ اور ہر سائز کی گاڑیوں سے اٹی ہوتی ہے۔ ان گاڑیوں میں بچے سوار ہوتے ہیں جنہیں سکول لے جایا جا رہا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ بچے بڑے بڑے سکولوں میں پڑھتے ہوں گے جہاں فیسیں بھی زیادہ ہوں گی۔ تعلیم کا معیار بھی ہائی ہوگا۔ بچے کیا پٹ پٹ انگریزی بولتے ہوں گے، اور پھر ان کی آنکھوں میں بھرا اعتماد جو اسی تعلیم کا ثمر ہے۔ یہ کل کے روسا ہیں۔ انہی نے ہمارے ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔ اور ان کے مقابلے میں ایک میرے بچے ہیں۔ سرکاری سکولوں میں پڑھنے والے۔ ان کی آنکھوں سے چھلکنے والا صدیوں سے وراثت میں چلا آ رہا احساس جرم۔ یہ کل کے سرکاری ملازم ہیں۔ ان دفتروں کو جنہیں ہم خالی کریں گے یہ بھر دیں گے۔ میری ہی طرح ویگنوں میں خوار ہوں گے اور گنجان ٹریفک والی سڑکوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے امراء کے بچوں کو دیکھیں اور میری ہی طرح پھر اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچیں اور کڑھیں گے۔ لیکن اس چکر

ویو سے مفر کسی کو نہیں ہے۔ میرا باپ، اس کا باپ اور پھر اس کا باپ۔ میری اولاد، ان کی اولاد اور پھر ان کی اولاد۔ یہ سب اسی چکر ویو کا حصہ ہیں۔

زندگی مجھے کبھی بھی سہل معلوم نہیں ہوئی۔ لیکن پھر بھی ہمیشہ خواہش رہی کہ اس میں کچھ معنی پیدا کیے جائیں۔ لیکن ایک عرصہ اس خواہش کے زیر اثر رہنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ دراصل یہ سارا عرصہ میں نے ایک اور طرح کے احساس کو دبانے اور رد کرنے میں بسر کیا تھا۔ اور وہ احساس اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ زندگی بے معنی ہے۔ ہر شے ناپائیدار ہے۔ میں بھی 'میری خواہشیں بھی' اور یہ سب کچھ جنہیں دیکھ کر میں کڑھتا ہوں۔ بس جبھی زندگی کی لایعنیت مجھ پر افشاء ہوئی۔ مجھے ہر شے لغو معلوم ہونے لگی۔ میرا دفتر، دفتر کی مصروفیات، میرے دوست احباب اور ان کی دلچسپیاں، ارد گرد لوگ اور ان کی زندگیاں، یہ پوری کائنات اور خود میں۔ جب سب کچھ لایعنی ہو جائے تو پھر بامعنی بات اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس لایعنیت کو ختم کر دیا جائے۔ 'ہونا' بے معنی ہے تو 'نہ ہونا' بامعنی۔ یہ میرا نتیجہ ہے جس تک میں پہنچا۔

لایعنیت کوئی گوارا نہیں کرتا۔ ہم سبھی اپنی اپنی زندگیوں کو بامعنی بنانے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لیے ہم میں سے کوئی مرنا نہیں چاہتا کیونکہ موت ہمارے لیے لایعنیت ہی کی ایک صورت ہے۔ میرا نتیجہ اس سے برعکس ہے۔ میں بھی لایعنیت کے خلاف جنگ کر رہا ہوں اور میں مرنا چاہتا ہوں۔ 'ہونا' بے معنی ہے تو 'نہ ہونا' بامعنی۔

موت کے بارے میں میرے ذہن میں کوئی واضح تصورات نہیں ہیں۔ میں کوئی فلسفی یا عالم دین نہیں ہوں۔ جنت جہنم کا بھی مجھے کچھ ٹھیک سے یقین نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا کچھ ہو۔ کچھ ہوا تو ظاہر ہے جہنم ہی میرے حصہ میں آئے گا۔ لیکن شاید وہ اتنا اذیت ناک نہ ہو بلکہ یقیناً نہیں ہو گا، جتنی یہ زندگی ہے جس سے میں چھٹکارا پانا چاہتا ہوں۔ خیر، چاہے اس کے بعد جو کچھ بھی ہو، کم از کم فی الوقت میں اس ناگوار صورت حال سے تو چھٹکارا پا جاؤں گا جس میں اب مبتلا ہوں۔ اور یہی کچھ میں چاہتا ہوں۔

خواب تو ہر شخص دیکھتا ہے۔ اچھے بھی اور برے بھی۔ میں نے بھی ایک خواب دیکھا ہے اپنی موت کا۔ میں نے یہ خواب دیکھا کہ میں اپنی موت پر قادر ہوں۔ میں ایک ایسی موت مر رہا ہوں جو میری اپنی ہے۔ جو میرے مقرر کردہ وقت پر مجھ تک آئی اور ویسے ہی آئی جیسا میں چاہتا ہوں۔ کوئی بھی اپنی مرضی سے پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بطور انسان کسی بھی انسان کی ہتک ہے۔ زیادہ تر تو اپنی مرضی سے مرتے بھی نہیں۔ لیکن چند ایک میرے جیسے جو خود فیصلہ کریں اور پھر ایسا کر کے بھی دکھائیں کم از کم اپنی ہتک کا کچھ بدلہ تو لے ہی لیتے ہیں۔ مجھ پر میری مرضی کے خلاف ایک پابندی عائد کی گئی۔ میں احتجاجاً اس جبر کا خاتمہ کر دیتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر میرے ہونے کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

میں تنہائی پسند نہیں ہوں۔ لیکن میں تنہائی میں مرنا پسند کروں گا۔ موت ایک انتہائی ذاتی واقعہ ہے جسے کسی اور کے ساتھ شیئر نہیں کیا جا سکتا۔

آج میں گھر میں تنہا ہوں اور مرنے کے لیے اس سے بہتر صورت حال اور کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن میں اپنے پسندیدہ حالات میں موت کو قبول کرنا چاہوں گا۔ میرے بیڈ روم میں سبز پردے لگے ہیں۔ مجھے سبز رنگ پسند ہے۔ جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ یہ جو مذہبی صحائف میں الہامی نور کا ذکر ہے تو یہ ضرور سبز رنگ ہی کا ہو گا۔ بالکل سفید رنگ تو ویسے بھی آنکھوں کو چبھتا ہے۔ میں چاہتا ہوں مروں تو میرے آس پاس ہر چیز سبز رنگ کی ہو۔ بستر کی چادر، سرہانے کا غلاف، میرا لباس، جوتے، لیٹے ہوئے سامنے دیوار پر دکھائی دینے والی پینٹنگ اور ہر شے۔ میں یہ سب چیزیں آج ہی خرید لوں گا۔

مہینے میں دو ایک بار میں فیشن میگزین 'شفق' کے پرانے شمارے خریدتا ہوں۔ نیا اتنا مہنگا ہے کہ کبھی خریدنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ آج پہلی اور آخری بار اس کا تازہ شمارہ خریدوں گا، 325 روپے کا۔ پوری تنخواہ میری جیب میں ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ روپے ہیں۔ ماہ بھر پہلے دفتر میں میری کمیٹی نکلی تھی۔ میں نے رضیہ سے ان پیسوں کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ تب میرا یوں مرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں بازار سے اپنی پسند کا کھانے کا سامان بھی لوں گا۔ سیخ کباب، حلوہ پوری، دہی کی لسی، فالودہ، چکن کارن سوپ، نمکین سکنجبین۔ مجھے مکیش پسند ہے۔ خاص طور پر اس کے شوخ گانے جو وہ اپنی پرسوز آواز میں گاتا ہے۔ دو تین اچھی کیسٹیں خرید لوں گا۔ آج کا سارا دن شاپنگ ہی میں صرف ہوگا۔ گھر لوٹتے ہوئے شاید شام ہو جائے۔ اندھیرا مجھے پسند نہیں ہے۔ کم از کم مرنے کے لیے تو یہ بہت غیر مناسب کیفیت ہے۔ صبح ہونے کا انتظار کروں گا۔ فجر کے وقت جب افق میں روشنی کی لکیر پھیلنی شروع ہوگی، میں اپنی موت قبول کر لوں گا اور ہمیشہ کے لیے سو جاؤں گا۔

ہاں میں سو جاؤں گا۔ جاگتے ہوئے مرنا اور خود اپنی موت کا منظر دیکھنا، کیسا ڈراؤنا تصور ہے۔ مجھ سے تو ایسا نہیں ہو پائے گا۔ بہتر ہے سوتے ہی میں روح جسم کا ساتھ چھوڑ جائے اور مجھے کانوں کان خبر نہ ہو۔ بہت عرصہ پہلے ہماری گلی میں ایک بارہ تیرہ برس کا بچہ تین منزلہ مکان کی چھت سے نیچے گلی میں گر گیا تھا۔ میں نے ہی جا کر اسے گود میں اٹھایا۔ وہ ہولے ہولے کپکپا رہا تھا جیسے اسے ٹھنڈ لگ رہی ہو۔ میں نے اس کی آنکھوں میں موت کی سفیدی ابھرتے دیکھی اور میرے سامنے بلکہ میرے ہاتھوں ہی میں اس نے دم دیا۔ بظاہر اسے کہیں بھی چوٹ نہیں آئی تھی۔ کہیں سے خون نہیں نکلا تھا۔ بس موت اس کی آنکھوں میں اتری اور وہ مر گیا۔ اس واقعہ کو یاد کرتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ میں چاہتا ہوں جب یہ سفیدی میری آنکھوں میں اترے تو میں اسے نہ دیکھ پاؤں۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ نیند کی بہت سی گولیاں کھا لوں گا۔ پوری ڈبیہ، یا دو ڈبیاں۔ ہاں یہی بہتر ہے۔ میں سو جاؤں گا اور پھر شاید مجھے پتہ بھی نہ چلے اور اسی نیند میں چل بسوں۔

میری بیوی پڑھی لکھی ہے۔ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں ہے کہ اس نے کس درجے تک پڑھ رکھا ہے۔ شادی سے پہلے اور کچھ عرصہ بعد تک سکول میں پڑھاتی بھی رہی۔ پھر بچوں اور خانہ داری میں مصروف ہو گئی اور نوکری چھوڑ دی۔ میرے بعد کہیں نوکری کر لے گی۔ میرے سسرالی ایسے گئے گزرے نہیں ہیں کہ ان چاروں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیں۔ میری گریجوایٹی اور پراویڈنٹ فنڈ کی رقم بھی میرے لواحقین کو سہارا دے گی۔ میرے جیتے جی وہ میری توجہ اور محبت سے محروم رہے۔ میرے مرنے کے بعد، اس لیے کہ مظلوم ہو جائیں گے، انہیں بہت سی ہمدردیاں اور محبت مل سکے گی۔ میں اپنے طور پر حساب لگاتا ہوں کہ میرا نہ ہونا میرے ہونے کی نسبت ان کے حق ہی میں ہے۔ میں انہیں بوجھ سمجھتا ہوں۔ انہیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ میرے نہ ہونے سے کم از کم انہیں اچھی نظر سے نہ دیکھنے والا ایک شخص تو دنیا میں کم ہوگا۔

میں اپنا مکان اپنی بیوی کے نام کرتا ہوں۔ میرے اکاؤنٹ میں بھی کچھ رقم ہے۔ ہزار روپے یا سو دو سو کم یا زیادہ۔ گریجوایٹی اور پراویڈنٹ فنڈ کی رقم بھی اسی کے پاس ہوگی۔ کافی آسرا ہو جائے گا۔ وہ بہتر جانتی ہے۔ مجھ سے بہتر بلکہ بہت سوں سے بہتر کہ ان وسائل کو کس طرح اور کہاں استعمال کیا جائے۔

میں جانتا ہوں، وہ مجھے جانتی ہے۔ شاید مجھے معاف کر دے۔ ہو سکے تو بچوں تک میرا یہ خط نہ پہنچنے دے۔ میں نہیں چاہتا وہ میرے

بارے میں کسی طرح کی الجھن کا شکار ہوں۔ میں خودکشی کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے ان سے کچھ چھپا تو نہ رہے گا۔ لیکن ایسا کیوں ہوا، یہ سمجھنا شاید ان کے لیے مشکل ہو۔ اس خط کو پڑھ کر تو اور بھی زیادہ۔ خیر جیسا میری بیوی بہتر سمجھے۔ میں نے کہا نا کہ وہ ایک سمجھدار عورت ہے۔ ایسے تمام معاملات کو مجھ سے بلکہ بہت سوں سے بہتر نپٹا سکتی ہے۔ اس دنیا اور اس زندگی سے چھٹکارا پانے کی خوشی میں اپنی بیوی اور بچوں کے لیے میرا آخری پیار.........

رشید احمد

اسی شام ایک واقعہ ہوا۔

نیپیر روڈ کے مین چوک میں ایک تیز رفتار ویگن نے سڑک پار کرتے ہوئے ایک شخص کو بری طرح کچل دیا۔ ڈرائیور کو، جو ویگن چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا، لوگوں نے فوراً ہی قابو میں کر لیا۔ حادثہ اتنا شدید تھا کہ کچلے جانے والے شخص نے موقع ہی پر دم توڑ دیا۔ اسے ہسپتال لے جانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ پولیس کوئی آدھ گھنٹہ بعد موقع واردات پر پہنچی جب تک لاش کے گرد پھیلا خون سوکھ کر سیاہی مائل بھوری رنگت اختیار کر چکا تھا اور راہ گیروں کا بہت بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ مرنے والے کے ہاتھ میں سامان سے بھرے پولی تھین کے دو ایک بڑے لفافے تھے۔ تصادم ایسا شدید تھا کہ وہ شخص خود ویگن سے ٹکرا کر دور جا گرا اور اس کا اسباب خاصے فاصلے پر بکھر گیا۔ راہ گیروں ہی نے ان اشیاء کو سمیٹا اور لاش کے پاس ڈھیر کر دیا۔ یہ سامان مختلف النوع تھا۔ سبز کپڑے کے پارچہ جات، بستر کی چادر اور تکیے کے اوچھاڑ، نئے جوتے، ہلکیش کے گانوں کی دو کیسٹیں، جدید فیشن کے میگزین 'شفق' کا تازہ شمارہ اور ایسا ہی کچھ اور چھوٹا موٹا کھانے پینے کا سامان۔

☆☆☆

اس شام نیپیر روڈ کے مین چوک میں جو حادثہ ہوا، میں اس کا چشم دید گواہ ہوں۔ جن لوگوں نے لاش کے اردگرد بکھری اشیاء سمیٹیں میں بھی ان میں شامل تھا۔ تبھی ایک طرف مجھے مرنے والے کا بٹوہ پڑا دکھائی دیا۔ میں نے اور سامان کے ساتھ اسے بھی اٹھا لیا لیکن جب یہ سامان لاش کے پاس جا کر رکھا تو بٹوہ کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔ میری توقع کے برعکس اس میں بہت تھوڑی رقم تھی۔ دو سو اور کوئی بارہ تیرہ روپے۔ کچھ وزیٹنگ کارڈز تھے، ٹیلی فون ڈائریکٹری، شناختی کارڈ اور کچھ ایسا ہی سامان۔ وہیں ایک خانے میں مجھے یہ خط بھی ملا جو گزشتہ صفحات میں آپ نے ملاحظہ کیا۔

یہ واقعہ ہوئے آج بارہ برس بیت چکے ہیں۔ میں ایک لکھاری ہوں۔ لیکن بالکل غیر معروف اور مفلوک الحال۔ میری گزر اوقات ایک ڈائجسٹ میں پروف ریڈنگ کے عوض ملنے والی واجبی سی رقم پر ہوتی ہے۔ اکیلی جان ہوں۔ پیچھے کوئی رونے والا نہیں۔ نہ کوئی ذمہ داری ہے۔ میرے اور رشید احمد کے حالات میں خاصا فرق ہے۔ لیکن حیرت انگیز طور پر میرے اور اس کے خیالات میں رتی برابر اختلاف نہیں ہے۔

یہ خط ملنے کے کچھ عرصہ بعد میں رشید احمد کی بیوہ رضیہ خاتون سے ملا۔ معلوم نہیں کیوں میں نے یہ خط اسے دکھانا ضروری سمجھا۔ پہلے تو کچھ عرصہ یہی سوچ کر خود کو روکتا رہا کہ خواہ مخواہ ان لوگوں کو، جو مرنے والے پر رو دھو بیٹھے تھے، پھر سے پریشان کرنے والی بات ہے۔ لیکن میں خود کو

روک نہیں سکا اور اس کے گھر پہنچ گیا۔ اس کی بیوہ کو یہ خط تھمایا اور تمام روداد بیان کی کہ کس طرح مجھے یہ خط ملا۔ اس بٹوے کا البتہ ذکر نہ کیا جس میں سے اصل میں مجھے یہ ملا تھا۔ عورت نے خط پڑھتے ہی پھاڑ دیا بلکہ میرے سامنے جلا دیا۔ پھر زار و قطار روتے ہوئے مجھ سے وعدہ لیا کہ کسی سے اس کا ذکر نہ کروں۔ خاص طور پر اس کے خاندان کے دیگر افراد اور بچوں سے۔ میں نے وعدہ کیا اور اٹھ کر چلا آیا۔

خوش قسمتی سے میں نے اس خط کی ایک کاپی پہلے سے بنوا کر سنبھال لی تھی۔ بارہ سال سے یہ خط میرے پاس ہے۔ اس دوران میں رشید احمد کے دوست کے طور پر برابر اس کے گھر جاتا رہا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں رشید احمد کی موت کے اصل اسباب جاننا چاہتا تھا جن کا اس خط میں ذکر نہیں تھا۔ لیکن ایک تو مجھے اندازہ تھا کہ خط میں لکھی گئی کسی بات کے علاوہ شاید ہی کوئی بات جان پاؤں۔ اور دوسرے میں خود بھی اس بارے میں پر یقین نہیں تھا کہ کیا واقعی میں اسی لیے یہاں آتا ہوں۔

اس تمام برسوں میں اس کے بچے مجھ سے مانوس ہو گئے۔ وہ مجھے چاچا کہتے۔ ان کی ماں نے انہیں میرے بارے میں یہی بتایا تھا۔ خود اس عورت نے بھی شروع کے کچھ عرصہ کے علاوہ کبھی مجھ سے پردہ نہیں کیا۔ وہ مجھ سے کسی بہت قریبی دوست کی طرح دکھ سکھ کہتی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی گھر کے معاملات میں دلچسپی نہیں لی۔ دلچسپی تو خیر اب بھی نہیں ہے۔ میری دلچسپی اسے سننے میں تھی۔ اس بات میں تھی کہ وہ مجھ پر اتنا بھروسہ کرتی ہے۔ مجھے اتنا مان دیتی ہے۔ میں اسی نشے میں سرشار رہتا۔ شروع میں ہفتہ دو ہفتہ بعد اور پھر آہستہ آہستہ روز کے روز وہاں جانے لگا۔ رسالے کے دفتر سے چھٹی کرتا تو سیدھے رشید کے گھر پہنچ جاتا۔ وہ بھی تنہائی کی ماری تھی۔ اس کا دل لگا رہتا۔ کبھی کسی وجہ سے ناغہ پڑتا تو اگلے روز شکوہ کرتی۔ میں کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتا۔ حالانکہ اکثر وجہ کچھ بھی نہ ہوتی۔ سوائے اس کے کہ میں روز روز وہاں جانے سے متعلق الجھاؤ کا شکار ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ الجھن گھٹی نہیں بلکہ بڑھی۔ میں سوچتا آخر ہم دونوں کون ہیں، کیا ہیں۔ میں کس تعلق سے روز وہاں چلا جاتا ہوں۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہے۔ مجھے کیا سمجھتی ہے۔ اور یہ کہ خود میں اسے کیا سمجھتا ہوں۔ مجھے ضرورت محسوس ہوتی کہ سارے معاملے کا کوئی جواز پیش کروں۔

یہ سوالات شاید اس کے ذہن میں بھی پیدا ہوتے تھے۔ لیکن اس کے رویے میں مجھے کبھی کوئی الجھاؤ محسوس نہ ہوا۔ یا تو وہ اس بارے میں سوچتی ہی نہ تھی، یا پھر اس بارے میں بہت واضح تھی۔ میں کبھی نہیں جان سکا کہ وہ کیا سوچتی تھی۔ مجھے اس کی ہمیشہ بھیگی رہنے والی آنکھوں میں دور دور تک پھیلا خلا دکھائی دیتا۔ اس خلا میں گھپ اندھیرا تھا اور گہری چپ۔ وہ بات کرتے ہوئے بار بار اپنی آنکھیں ملتی۔ یہ اس کی عادت تھی۔ ملتے ہوئے دونوں آنکھیں میچ لیتی۔ تب میں خاموش بیٹھا اشتیاق سے اس کا چہرہ تکتا۔

چند روز پہلے وہ مر گئی۔ یوں لگا جیسے اچانک کوئی بہت سہانے خواب سے ان چاہے بیدار ہو جائے۔ میں بہت اوپر اڑان بھر کر پھر سے وہیں آ گرا تھا جہاں سے اٹھا تھا۔ اس کے بعد میں نے خود کو یوں تنہا محسوس کیا جیسے بارہ سال پہلے رشید احمد کی موت پر اس نے محسوس کیا ہوگا۔

اس کی موت نے مجھے خط کے بارے میں اس سے کیے ہوئے وعدے سے بھی آزاد کر دیا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اگلے چند ہی دنوں میں یہ خط اور اپنا بیان کسی رسالے میں برائے اشاعت بھیج دوں گا۔

اس تمام عرصہ میں کتنی ہی بار میں نے اس خط پر مبنی ایک کہانی لکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہمیشہ ناکام رہا۔ یا یوں کہیے کہ مجھ سے یہ پوری

ہی نہ ہو سکی۔ کوئی مناسب انجام کبھی نہ سوجھا۔ لیکن اب میں اسے مکمل کر چکا ہوں۔ ان تمام برسوں میں زندگی کو میں نے بہت برتا ہے۔ شاید رشید احمد سے کہیں زیادہ۔ اور موت کے بارے میں بھی بہت سوچا ہے۔ شاید رشید احمد سے کہیں زیادہ۔ لیکن آج جب میرے پاس آخری فیصلہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے تو میں اُس سے مختلف نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا جس پر رشید احمد مجھ سے کم تجربہ رکھنے کے باوجود بارہ برس پہلے پہنچا تھا۔

اشتہار آدمی

دیوار گیر میں رکھے کرم خوردہ لکڑی کے بڑے فریم والے ریڈیو میں معروف اشتہاری نغمہ چل رہا تھا۔ ''تازہ دل بہار چائے۔ تازگی لائے۔''

اپنے جہازی جثے اور کھڑکھڑاتی ہوئی آواز کے باعث یہ ریڈیو ریستوران بھر میں سب سے نمایاں شے تھی۔ یہ دروازے کے بالکل سامنے دیوار کے خانے میں پڑا تھا، سو اندر داخل ہوتے ہی نظر اس پر پڑتی۔ اسے دیکھ کر فوری طور پر جو بات ذہن میں آتی، وہ اس کے ماڈل کے تیس پینتیس برس پرانا ہونے کی بابت تھی۔ نچلی کانچ کی پٹی پر ٹیوننگ اور والیم کے دو بڑے بڑے کتھئی رنگ کے گول بٹن تھے۔ چوڑے ماتھے پر جالی دار دبیز زرد کپڑا منڈھا ہوا تھا جو ریڈیو کی آواز کے ساتھ ساتھ ہولے ہولے کپکپاتا۔ اسی پر ایک طرف جہاں کبھی کمپنی کے نام کا سٹیکر لگا ہو گا اب اتنی جگہ پر کپڑے کی رنگت باقی کی نسبت قدرے اجلی تھی۔ اسکی آواز کسی سٹیشن پر تو خوب کھلی اور پاٹ دار ہوتی لیکن عموماً دبی ہوئی اور بلغمی رہتی۔

اس نے نغمے سے محظوظ ہوتے ہوئے پیالی کو ہونٹوں سے لگایا۔ گرم چائے کا گھونٹ بھرا اور اندر مطبخ کے دروازے کی پیشانی پر لگی گھڑی کو دیکھا۔ دوپہر کے ایک بج کر انچاس منٹ ہوئے تھے۔ عام دنوں میں یہ وقت رش ٹوٹنے کا ہوتا ہے۔ لیکن آج شاید اس لیے کہ گوشت کے ناغے کا دن تھا، گاہک خلاف معمول زیادہ تھے۔ ناغے کے دنوں میں یہاں کے مینو میں کڑھی، حلیم اور سپیشل ڈش ''چکڑ چھولے'' کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے ریستورانوں سے بھی گاہک صرف ان ڈشوں کے لیے یہاں چلے آتے۔ چار پانچ بجے دفتر بند ہوتے تو یہ تجارتی علاقہ مفلس کی کٹیا کی طرح ویران اور بے آباد ہو جاتا۔ ریستوران بھی بند کر دیا جاتا۔

دوپہر کے کھانے کے علاوہ ریستوران کی آمدنی کا قریب قریب تمام دارومدار ہاف سیٹ اور فل سیٹ چائے کے آرڈرز پر تھا جو ارد گرد دفتروں سے اسے فراوانی سے ملتے۔ کھانے کے وقفہ میں ریستوران کی انتظامیہ چائے کے آرڈر نہیں بھگتاتی تھی لیکن یہ بندش اس کے لیے نہیں تھی۔ ریستوران کے مالک ملک صاحب سے اس کی صاحب سلامت تھی۔ وہ کاؤنٹر کے برابر ہی چھوٹے سٹول پر بیٹھ جاتا۔ ملک صاحب اپنے ہر دلعزیز بیرے کیپٹن کو سر ہلا کر اشارہ کرتے ہوئے کہتے ''پت چا لیا۔'' وہ دل بہار چائے کی دو پیالیاں لا کر کاؤنٹر پر رکھ دیتا۔ ایک اس کے لیے اور دوسری ملک صاحب کے لیے۔ دونوں ہی چائے کے اس برانڈ کے دلدادہ تھے۔ ''واہ جی واہ''۔ وہ چائے پیتا اور اس کی رنگت، خوشبو اور ذائقے کے گن گاتا۔

''بم چیز اے۔'' ملک صاحب چائے کی چسکی لیتے ہوئے ترنگ میں کہتے۔ لیکن روئے سخن ہرگز چائے کی طرف نہ ہوتا۔ مقصود اس خوش شکل ماڈل لڑکی کا ذکر ہوتا جو چائے کے ٹی وی کمرشل اور دیگر اشتہارات میں جلوہ گر ہوتی اور غالباً یہی ان دونوں کے بیچ تعلق داری کی بنیادی وجہ بھی تھی۔

ڈائننگ ہال میں بیٹھے گاہکوں نے خوب شور مچا رکھا تھا۔ بیسن کی ٹونٹی کھلنے بند ہونے کی شرر شرر، پلیٹیں اور گلاس میزوں پر رکھنے اور اٹھائے

جانے کی کھڑکھڑاہٹ اور سب سے زیادہ شور ایئر کولر کا تھا جو کہنے کو تو کھڑکی سے باہر لگا تھا اور اندر نم دار ٹھنڈی ہوا پھینکتا لیکن اس کے پنکھے کا شور کسی پرانی گاڑی کے خراب انجن سے کم تلخ اور تیز نہیں تھا۔ لیکن اس کی سماعت اس شور سے لاتعلق تھی۔ ریڈیو پر بجتا اس کا محبوب نغمہ اسے صاف سنائی دے رہا تھا اور وہ خود بھی گنگنا رہا تھا۔ ''روپ میں رنگ میں اس کا جواب نہیں۔''

''ذائقہ اپنی مثال آپ، پیجئے جناب۔''

''دل بہار چائے۔'' نسوانی آواز میں یہ الفاظ آخری مرتبہ دہرائے گئے۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ منٹوں کی سوئی پچپن اور ساٹھ کے ہندسوں کے بیچ اٹکی ہوئی تھی۔ ریڈیو پر ویسی ہی نسوانی آواز میں کسی کپڑے دھونے والے صابن کا اشتہار سنایا جانے لگا۔ اس نے پیالی میں سے چائے کی آخری چسکیاں لیں۔ دیر تک کلے اور دانتوں میں زبان پھیرتا رہا۔ گویا اس کے ذائقہ کی آخری رمق تک چکھنا چاہتا ہو۔

ملک صاحب کاؤنٹر کے عقب میں بیٹھے تھے۔ فقط ان کا نرخرے سے اوپری دھڑ شوکیس کی پٹی پر دھرا دکھائی دے رہا تھا۔ ان کی مخروطی ٹھوڑی کے عین نیچے شوکیس میں مختلف النوع ڈیزائن کی پیسٹریاں، تازہ کریم رول اور میٹھے کیک والی کشتیاں سو واٹ بلب کی روشنی میں قرینے سے سجی دکھائی دیتی تھیں۔ ایک طرف بسکٹوں کے پیکٹ اوپر تلے دھرے تھے۔ وہ سٹول سے اٹھ کھڑا ہوا اور دس روپے کا نوٹ شوکیس پر رکھ دیا۔ جب تک کہ ملک صاحب چار روپے کاٹ کر چھ اسے واپس کرتے، اس نے شتابی سے سامنے دیوار گیر کے بالائی خانے میں دھرے دل بہار چائے کے سبز دھاریوں والے زرد رنگ کے ڈبے شمار کیے۔ کل اٹھارہ تھے۔ ''سب بھرے ہوں گے؟'' اس نے شک کے ساتھ سوچا۔ ملک صاحب نے چھ اس کے آگے کاؤنٹر پر ڈھیر کر دیا۔ ایک پانچ کا نوٹ تھا اور ایک سکہ تھا۔

یوں تو اس کے چھوٹے اٹیچی کیس جیسے سرخ تھیلے میں، جو وہ ہر روز دفتر اٹھا کر لے آتا اور جو طرح طرح کے ضروری وغیر ضروری کاغذات، اخباری تراشوں اور کتابوں سے بھرا رہتا، دل بہار چائے کی پانچ دس تھیلیاں ہمیشہ موجود رہتیں کہ جب طلب ہوئی بیگ میں سے تھیلی نکالی، ابلتے پانی سے بھری پیالی میں اسے ڈبویا، گھولا، قہوہ بنایا اور بغیر دودھ کے چسکیاں لے کر پی لیا۔ تاہم اس کے باوجود دن میں تین چار بار یہاں چلے آنے کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ ملک صاحب سے اس کا ٹسر ملتا تھا۔

''ہور فیر'' ملک صاحب نے کرسی کی پشت سے، جس پر میلا تولیہ منڈھا گیا تھا، ٹیک لگائی اور ہولے ہولے مسکرانے لگے۔ وہ دھان پان سے آدمی تھے۔ ان کے استخوانی چہرے پر کھلی مسکراہٹ ماتمی پھولوں جیسی اداس اور سوگوار معلوم ہوتی تھی۔ مزاج کے رنگین واقع ہوئے تھے۔ حریص مکھی کی طرح ان کی گفتگو جنس کے شیرے پر بھنبھناتی۔ دل بہار چائے کی ماڈل لڑکی سے ان کی پسندیدگی کی وجہ خود ان کے الفاظ میں اس قاتل حسینہ کی خربوزوں جیسی بھری بھری چھاتیاں تھیں۔ اپنی پسندیدہ ماڈل کے بارے میں ایسی گفتگو کے جواب میں وہ فقط مسکرا کر ہی رہ جاتا۔

اس نے بقیہ گن کر پتلون کی داہنی جیب میں اڑس لیا۔ ریڈیو پر پرانا فلمی گانا بج رہا تھا ''پانڑی دا بلبلہ، او ہو ہو ہو، پانڑی دا بلبلہ۔'' آواز ایسی لرزاں اور بلغمی تھی کہ اسے الجھن ہونے لگی۔

''ہور کجھ وی نئیں۔ بچی گھٹ سی۔'' اس نے کہا۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن کھلتی بند ہوتی بیسن کی ٹونٹی، پلیٹیں اور گلاس میز پر رکھے اور

اٹھائے جانے کی کھڑ کھڑاہٹ اور ایئر کولر کے پنکھے کی گڑ گڑاہٹ۔ یہ آوازیں اسے الجھا رہی تھیں۔ گاہکوں میں سے کوئی کراری آواز میں یوں تیز بول رہا تھا جیسے کسی میچ کی کمنٹری کر رہا ہو۔ وہ مڑا اور بولا ''چاء وا جواب نئیں۔'' اس نے دیکھا ملک صاحب مسکرائے تھے اور کچھ کہا بھی تھا جسے وہ سن نہ سکا۔ ہال میں پڑے میزوں کے بیچ ٹیڑھا میڑھا چلتا ہوا وہ شتابی سے ریستوران سے باہر نکل آیا۔

شام کو وہ حسب معمول شبستان ریستوران میں اکرم کیچو کے ساتھ بیٹھا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں حمید شاعر اور راجہ انور اکٹھے اندر داخل ہوئے اور ان کے برابر کرسیاں سنبھال لیں۔ حمید شاعر اور اس نے ایک دوسرے کو دیکھ کر ناپسندیدگی کا تاثر ظاہر کیا تاہم بات اس سے آگے نہ بڑھی اور جلد ہی وہ سب ایک دوسرے سے رسمی بے نیازی برتنے کے بعد وزیر اعظم کی حالیہ تقریر سے متعلق بحث میں الجھ گئے جو اس نے اگلے ماہ پیش کیے جانیوالے سالانہ بجٹ اور ملکی اقتصادی ترقی کے لیے اٹھائے جانے والے حکومتی اقدامات سے متعلق گذشتہ روز قومی اسمبلی کے اجلاس میں کی تھی۔ واجبی سی دلچسپی ظاہر کرنے کے بعد وہ جلد ہی اس بحث سے اوب گیا۔

راجہ انور ایک صحافی تھا۔ دن بھر سیاسی چکر پھیریوں میں الجھا رہتا۔ سیاسی جلسے' سیاسی چالیں' سیاسی بیانات' اور سیاسی شخصیات سے انٹرویوز۔ کبھی کبھار سیاسی کالم بھی لکھتا۔ سیاست میں یوں لت پت ہوتا کہ شام کو بھی یہاں آ کر کوئی بات اس موضوع سے ہٹ کر نہ کر پاتا۔ حمید انقلابی شاعر تھا۔ وہ ان بحثوں میں انور سے بھی زیادہ پر جوش ہوتا۔ اکرم کیچو البتہ ایک آزاد منش اور لاابالی انسان تھا۔ تمام دن ریستورانوں میں بیٹھے رہنا، کتابیں پڑھنا اور دوستوں سے گپ بازی کرنا، اس کی زندگی کی کل سرگرمی بس یہی تھی۔ وہ سیاسی بحثوں میں نہ کبھی پر جوش سرگرمی ظاہر کرتا نہ ان سے بے زار ہی ہوتا۔ اس نے تینوں دوستوں کو دیکھا اور روز کے معمول کے مطابق بیرے مشتاق کو اشارہ کیا۔ اسے ابلتے ہوئے پانی سے بھری چار پیالیاں، دودھ چائے کی تھیلیاں اور چینی لانے کو کہا۔

''آج چائے میری طرف سے۔'' اس نے اپنا سرخ بیگ کھولتے اور دل بہار چائے کی تھیلیاں باہر نکالتے ہوئے کہا۔ ''عیش کرو۔'' کبھی کبھار خاص کر مہینے کے ابتدائی دنوں میں جب اسے لگتا کہ وہ خاصا دولت ہے تو انہیں یونہی عیش کرنے کے مواقع فراہم کرتا۔ پہلے چینی پیالیوں میں گھولی۔ پھر تھیلیاں ڈال کر انہیں دبا دبا کر رنگ نکالا اور قہوے کو گاڑھا کیا۔ پھر معمولی سا دودھ ٹپکایا۔ ''ٹرم، ٹرام، ٹرم'' اس نے چائے تیار ہونے کا نعرہ مارا۔ جب تک تینوں دوست چائے کی چسکیاں لیتے رہے، وہ بے تکان بولتا اور چائے کے محاسن گنواتے ہوئے زمین و آسمان کے قلابے ملاتا رہا۔ تینوں کو اپنی بحث ہمیشہ کی طرح ادھوری چھوڑنی پڑی۔ صاف ظاہر تھا وہ اس کی باتوں میں مطلق دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ لیکن چائے بھی تو مفت مل رہی تھی۔ حمید نے اکتا کر چائے میں چینی کم ہونے کی شکایت کی۔ ''یہ لسی نہیں ہے''۔ اس نے خفگی کے ساتھ کہا۔ ''او بابا میں شاعر ہوں۔ چینی شیرینی میرا مسئلہ ہے''۔ حمید نے چینی کا مگ اٹھایا اور ڈیڑھ چمچ چینی مزید پیالی میں انڈیل دی۔

اس نے حمید کی دخل در معقولات کو نظر انداز کرتے ہوئے موضوع بدلا۔ ''تم میں سے کسی نے رات کو ڈرامہ دیکھا تھا۔ ''تشبیب و فراز'' کسی نے اس بات کا جواب نہ دیا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔'' پھر تو کسی نے حنا بیوٹی کریم کا کمرشل بھی نہیں دیکھا ہوگا جو ڈرامے کے تینوں وقفوں میں چلایا

گیا تھا۔ وہی جس میں روبی تھی۔''

اس کمرشل کے بارے میں تو نہیں لیکن روبی کو وہ بھی جانتے تھے۔ اس لیے بھی کہ ان کا یہ دوست اس پر بری طرح لٹو تھا اور اس لیے بھی کہ خود ان کی بھی اس پٹیسے جیسی لڑکی پر رال ٹپکتی تھی۔ حمید شاعر نے شتابی سے چائے کی چسکیاں لے کر پیالی خالی کی اور سگریٹ سلگا لیا۔ ایک روز حمید نے ترنگ میں آ کر اعلان کیا تھا کہ پچھلی رات خواب میں اس نے روبی نامی ماڈل لڑکی کے ساتھ ایک سے زائد مرتبہ مجامعت فرمائی اور یہ کہ اس خوشگوار تجربہ کے زیر اثر اس نے ایک طویل نظم لکھنا شروع کی ہے جسے وہ چند ہی روز میں مکمل کر کے دوستوں کے گوش گزار کرے گا۔ تب اس نے حمید کو سخت سست کہا کہ کسی بھی شریف لڑکی کے بارے میں ایسے نازیبا کلمات اسے زیب نہیں دیتے۔ اسی روز سے دونوں میں سرد تناؤ سا تھا۔

''یار کیا کلر کمبینیشن تھا۔ سفید ساڑھی، بالکل دودھ جیسی، ہلکی سرخ لپ سٹک، سفید موتیوں کی مالا۔۔۔۔۔۔'' وہ خیالوں میں روبی کے سراپے کو تصور کر کے مزے سے سر ہلانے لگا۔ معلوم نہیں کیوں راجہ انور بالکل ہی اکھڑ گیا۔ پٹاخ سے بولا ''تینوں روبی وچ کیہ دسنا اے۔ ایویں جھین چودی نی تعریفاں کر کے ماڑا مغز چٹنا ایں۔ اینی چنگی لگنی ایں تے جا کے رات ناٹیم مکا چھوڑسی یارا۔'' وہ چپ ہو کر اور چہرہ لٹکا کر دونوں دوستوں کو ٹکر ٹکر تکنے لگا جیسے کسی نے کوئی ایک لفظ بھی مزید کہا تو رو دے گا۔

''اوہ پاپا نہیں اے فوٹو گرافر شجاعت۔ اوس نے ساریاں نوں چکھیا ہویا اے۔ اوس میکی آپ آکھیا سی کہ تو گل کر۔ تیرا اوس تے اپناں ای دل وجھنا اے تے شجاعت نوں آکھنے ہاں۔ اوس نال پکی پکی مکا چھوڑس۔'' وہ ٹھیس لگے ہوئے دل کے ساتھ کچلی ہوئی آواز میں بولا ''توں زیادتی کر رہیاں ایں۔'' اکرم کیچو نے دونوں میں ہونے والی گفتگو میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ خاموشی سے پرے دیوار میں لگے آئینے میں اپنے پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں کو تکتا رہا۔

حمید شاعر سے نہ رہا گیا۔ ہولے ہولے مسکراتے ہوئے بلند آواز میں بولا ''اساں تے مفاہمت پکی مکالئی سی۔'' اس بات پر اس کے علاوہ تینوں نے ایک فرمائشی قہقہہ بلند کیا۔ اس نے خاموشی سے میز پر سے اپنا سرخ تھیلا اٹھایا اور ریستوران سے باہر چلا گیا۔ کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

بس اسی دن سے اس کا دل دوستوں اور شبستان ریستوران سے پھر گیا۔ وہ سہ پہر کو دفتر سے نکل کر کریم روڈ کی طرف جانے کے بجائے، جدھر شبستان ریستوران واقع تھا، فضل الحق روڈ سے ہوتا ہوا سپر مارکیٹ کے سٹاپ تک پیدل جاتا۔ موسم اچھا ہوتا تو سینٹرل پارک کا چکر لگا لیتا جو راستے ہی میں پڑتا تھا۔ دیر تک گھاس پر چت لیٹا سستاتا اور آسمان پر تیرتے بادلوں کی ٹکڑیوں اور گھونسلوں کو لوٹتے پرندوں کو تکتا۔ کھلے آسمان کو تکنا اسے اچھا لگتا۔ بچپن میں وہ ایک کھیل کھیلتے تھے جس میں وہ گردن آسمان کی طرف اٹھائے اور بازو پھیلائے پیروں پر گھومتے۔ کیسے ہر شے بدل جاتی تھی' منظر ہی نہیں' آوازیں بھی۔ حتیٰ کہ پھر کسی بچے کو چکر آتا اور وہ گر جاتا۔ سارے ہی اس کو ایک ایک دھپہ مارتے۔

شام گہری ہوتی تو وہ گھاس پر سے اٹھتا' سٹاپ تک جاتا اور واپسی کے روٹ کی ویگن پر سوار ہو جاتا۔ رات آٹھ بجے تک گھر پہنچتا، کھانا کھاتا، ٹی وی دیکھتا اور دس گیارہ بجے کے لگ بھگ کمرے میں جا کر لیٹ جاتا۔ یہ نیا معمول اسے خاصا موافق معلوم ہوا۔ شبستان ریستوران جانے

کا معمول ترک کرنے سے اسے گھر میں گزارنے کے لیے زیادہ وقت ملتا۔ نیند البتہ اپنے معمول کے مطابق بارہ بجے سے پہلے نہ آتی۔ وہ بستر پر چت لیٹا چھت کو گھورتا رہتا۔ طرح طرح کے خیالات اس کے تھکے ہوئے ذہن میں گردش کرتے۔ روبی کے بارے میں انور نے جو مغلظات بکی تھیں اس کا اسے بہت افسوس تھا۔ معلوم نہیں کیوں اسے لگتا جیسے کسی طور روبی نے یہ سب کچھ سن لیا تھا اور ظاہر ہے اسے اچھا نہیں لگا ہوگا۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا کہ خیالات کی رو میں بہک کر خود اس کے ذہن میں بھی روبی کے بارے میں کوئی ایسا ہی الٹا سیدھا خیال در آتا۔ فوراً ہی خود کو ملامت کرتا۔ لیکن خوابوں پر بھلا کیا بندش۔ خوابوں میں کبھی کبھار وہ اس کے بہت قریب ہو جانے سے خود کو روک نہ پاتا۔ اتنا قریب کہ اس کے بالوں کی مہک محسوس کرتا اور اس کے رخساروں پر باریک باریک مہاسوں کو دیکھ پاتا جو پاؤڈر کی تہہ تلے دور سے دکھائی نہ دیتے تھے۔ جس روز اس نے پہلی بار خواب میں روبی کو برہنہ دیکھا اور اس سے مجامعت کی کوشش میں جاگ اٹھا تو اسی وقت اس سے بالمشافہ ملنے کا فیصلہ کیا۔

(۲)

یہ بہت پرانی بات نہیں تھی جب اس نے پہلی بار روبی کو دیکھا۔ وہ ماڈلنگ کے شعبے میں نئی تھی۔ اسے لگا وہ کسی کالج کی طالبہ تھی اور شوقیہ طور پر کام کرتی تھی۔ حمید شاعر اپنی مغلظ سوچ کے باعث اسے اس بازار سے متعلق قرار دیتا۔ لیکن اس بات کی اس کے نزدیک کچھ اہمیت نہیں تھی اور نہ ہی یہ بات اس کے خیال میں مبنی بر صداقت ہو سکتی تھی۔ کیا اس بازار کی لڑکیاں صاف پہچانی نہیں جاتیں۔ لوگوں کی ایسی ہی مکروہ سوچ ہے جو شریف گھروں کی لڑکیوں کو شوبز میں آنے سے روکتی ہے۔

اس نے پہلی بار روبی کو ملبوسات کے اشتہار میں دیکھا۔ اسی رات اپنی نیلی جلد والی ڈائری کھولی جس میں وہ گاہے بگاہے مختلف ماڈل لڑکیوں کے بارے میں اپنی رائے درج کرتا تھا۔ صفحے کے شروع میں نام کی جگہ چھوڑ کر نچلی سطر میں لکھا ''چھریرے بدن کی اور نوعمر ہے۔ انیس بیس برس سے زیادہ کیا ہوگی۔ جلد نرم و گداز، رنگت گندمی مگر کھلتی ہوئی۔ ہڈ پیر چوڑے اور متناسب ماس بوٹی کے ساتھ نظروں کو بھلے لگتے ہوئے اعصاب مضبوط اور تنے ہوئے جسم کے نشیب و فراز خوب نمایاں۔ چہرے بشرے سے کسی اچھے خاندان کی اور پڑھی لکھی لگتی ہے۔ شوخ و چنچل ہے۔

سپریم فیبرکس کے اشتہار میں کھلے گلے والی قمیض پہن کر کیسی قیامت لگ رہی تھی۔ اس پر اس کی کلر کمبینیشن کی حس۔ کس رنگ کے لباس کے ساتھ کس رنگ کی لپ سٹک لگائی ہے، کس رنگ کے ٹاپس پہنے ہیں، بیگ یا پرس کون سا اور کس رنگ کا ہو۔ زیورات کیسے ہوں۔ یہ کچھ ایسے سلیقے سے کرتی ہے کہ اس کی اعلیٰ ذوقی کی تعریف کیے بنا نہیں بنتی۔ تھوڑا عرصہ اور ٹھہر گئی تو بڑے بڑوں کے چھکے الٹا دے گی۔

اسے چاہئے ابھی سٹلز پر زور دے۔ سینہ تان کے' کمر کا بل نمایاں کرے' بظاہر کسی تناؤ کے بغیر چلنا ایک ہنر ہے۔ میری مانے تو کسی اکیڈمی میں داخلہ لے۔ اب تو فیشن کی اکیڈمیاں کھل گئی ہیں۔ کیا کچھ نہیں سیکھا جا سکتا۔''

روبی کی تصویر والا پوسٹر اسے کسی اخبار یا رسالے میں دکھائی دیتا تو فوراً اسے خرید لیتا اور لا کر کمرے کی دیوار پر چسپاں کر دیتا۔ دروازے سے الماری تک اور الماری کے دوسرے کونے سے اس کی چارپائی تک' تمام دیواریں بس اسی کی تصویروں سے لدی پھندی تھیں۔ حتیٰ کہ اس خالی چوکھٹے میں بھی ایک روز اس نے روبی کی تصویر جڑ دی جو مدت سے خالی پڑا تھا اور جو بستر پر سیدھے لیٹے ہوئے بالکل سامنے دکھائی دیتا تھا۔ یہ تصویر

اس نے ایک اخبار کے رنگین فلمی ایڈیشن سے لی تھی اور یہ پورے اخباری صفحے جتنی تھی۔ وہ باریک جالی دار کپڑے کا لباس پہنے ہوئے تھی جس میں اس کے جسم کے نشیب و فراز اور خطوط خوب ابھرے ہوئے دکھائی دیتے۔ وہ ایک سٹول پر ادا سے بیٹھی تھی۔ عقب میں سرخ رنگ کا لہر دار پردہ تھا جس پر پھول بوٹے کشیدہ کیے ہوئے تھے۔ اس تصویر میں وہ اسے اتنی خوبصورت لگی کہ وہ اسے اپنا دل دے بیٹھا۔ کیا ایسی ہی لڑکی نہیں تھی جو ہمیشہ سے اس کے خیالوں اور خوابوں میں بسی ہوئی تھی۔

تاہم ایک رات ٹی وی پر دکھائے جانے والے ایک ڈرامے نے اسے دنوں اداس رکھا۔ یہ قلعی کرنے والے ایک نوجوان کی پریم کہانی پر مبنی تھا۔ اسے ایک امیر لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے۔ وہ ایسی موہنی صورت اور پیار سے بات کرنے والی لڑکی ہے کہ یہ فوراً اس کو دل دے بیٹھتا ہے۔ یکطرفہ ہی سہی، محبت کی کہانی آگے بڑھتی ہے۔ وہ فیصلہ کرتا ہے کہ بہت ساری دولت کمائے گا تاکہ اس شہزادی کے لیے اس کے باپ کے گھر سے بھی عالیشان محل بنا سکے۔ پھر اسے شادی کی پیشکش کرے گا۔ وہ ایسا سوچتا ہی رہ جاتا ہے کہ لڑکی کی کسی امیر گھر میں شادی ہو جاتی ہے۔ ناکام محبت کے صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے ایک روز وہ پینٹ کرتے ہوئے خود کو سیڑھی سے نیچے گرا لیتا اور خودکشی کر لیتا ہے۔

اس ڈرامے نے اس کے دل پر جیسے دکھ کا بھاری پتھر رکھ دیا۔ اس نے اپنے روزنامچہ میں لکھا "میرا بس چلے تو کسی عاشق کو مرنے نہ دوں۔ جو جس سے محبت کرتا ہے وہ اسے ملنا ہی چاہیے۔ محبت سے بڑا حق اور بھلا کیا ہوگا۔" اس نے فاؤنٹین پن کے ڈھکن کو دانتوں میں چباتے ہوئے مختلف سوالوں پر غور کیا جو محبت کے حوالے سے اس کے ذہن میں پیدا ہوئے تھے۔ ہر سوال اس کے الجھاؤ کو بڑھاتا۔ اس نے لکھا "جو محبت کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں کیا وہ دنیا کی سب سے سخت سزا کے مستحق نہیں ہیں۔ اور جو محبت کا جواب محبت سے نہیں دیتا وہ۔۔۔؟"

یہ گرم موسم کا اثر تھا جو پچھلے کچھ دنوں سے شدید ہو گیا تھا، یا صحت کی خرابی تھی یا کوئی اور وجہ تھی کہ اس کی طبیعت بوجھل رہتی۔ کام سے جلد تھک جاتا۔ نہ کھانے میں کچھ رغبت باقی رہی، نہ دفتر کے کام میں۔ رات کو جلد سو جاتا اور اکثر کھانا کھائے بغیر ہی۔ صبح اٹھنے پر بھی خود کو تھکا تھکا محسوس کرتا۔ تمام دن یہ تھکن گہری ہوتی۔ شام تک وہ اتنا نڈھال ہو جاتا کہ کبھی اسے تشویش ہوتی۔ کہیں وہ بیمار تو نہیں ہے۔

یہی دن تھے جب وہ خاص واقعہ ہوا جس نے اس کی زندگی میں کایا کلپ کا عمل کیا۔

وہ عام دنوں جیسا ہی ایک دن تھا۔ روکھا، پھیکا، گرم اور معمول زدہ۔ وہ چھٹی کے بعد دفتر سے نکلا اور معمول کے مطابق سپر مارکیٹ کے سٹاپ کی طرف ہو لیا۔ موسم اچھا تھا اس لیے راستے میں سینٹرل پارک کو مڑ گیا۔ ہمیشہ کی طرح ٹہلتا ہوا اپنے مخصوص خاموش گوشے، جو پیپل کے ایک بہت پھیلی ہوئی شاخوں والے کہن سالہ درخت کے قریب ہی واقع تھا، میں جا کر گھاس پر لیٹ گیا۔ وہاں اس کا جی نہ لگا۔ آسمان کو تکنا بھی آج اسے نہیں بھا رہا تھا۔ آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور اسے اونگھ آئی تو وہ اٹھا اور ویگن سٹاپ کی ہو لیا۔

تھکن اس کے اعصاب میں ایک زندہ شے کی طرح سنسنا رہی تھی۔ ویگن کی نشستیں سواریوں سے پر تھیں۔ سترہ نشستوں پر اکیس سواریاں بیٹھی تھیں۔ اگلے دو ایک سٹاپوں پر مزید چار پانچ سواریاں ویگن میں چڑھیں اور نشستوں کے بیچ منہ آگے ڈرائیور کی طرف کیے دہری ہو کر کھڑی ہو گئیں۔ بدن سے بدن جڑا ہوا تھا اور ماحول میں پسینے کی بساند موجود تھی۔ کنڈیکٹر باہر دروازے سے لٹکا تھا۔ وہ اندر گھسی ہوئی سواریوں پر

سرسری نگاہ ڈالتا اور اپنے طور پر مزید سواریوں کی گنجائش محسوس کرتے ہوئے ہر سٹاپ پر ویگن رکوا کر، جھٹ موڑ، داروغہ والا، کی آوازیں لگاتا۔ اس کے دائیں طرف اندرونی چرغی پر آگے پیچھے سرکنے والا گیٹ لگا تھا جسے وہ ہر سٹاپ پر تیزی سے کھینچ کر کھولتا اور پھر اسی رفتار سے آنافانا بھیڑ دیتا۔ گیٹ کی اندرونی سطح پر مختلف فلمی اداکاراؤں کی کتنی ہی چھوٹی بڑی تصویریں چسپاں تھیں۔ انہی میں ایک عام کتابی سائز کا پوسٹر بھی لگا تھا جس میں روبی ایک ٹوتھ پیسٹ کو دائیں ہاتھ کی تین انگلیوں میں پکڑے اور اسے اپنے داہنے برہنہ سڈول شانے پر ٹکائے مسکرا رہی تھی۔ شانوں سے سرکتی ہوئی اس کی نگاہ اس کی موہنی مسکراہٹ پر آ کر جم گئی جو ایسی شفاف اور واضح تھی کہ ہونٹوں پر افقاً پھیلے ہوئے نور کی مانند معلوم ہوتی۔ ہونٹ ایک ہیضے کی صورت میں پھول سے کھلے ہوئے تھے۔ اس منظر نے ماحول کے بوجھل پن اور اس کی ذہنی کلفت کو دور کر دیا۔ لڑکی سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں جنہیں وہ ہولے ہولے جھپک رہی تھی۔ اسے لگا ان نگاہوں میں کتنے ہی ان کہے سندیسے تھے۔ ان کی نیلگوں گہرائیوں میں رنگ رنگ کی موجیں مچل رہی تھیں۔ یہ محبت کے رنگ تھے جن میں گویا کائنات کے سبھی رنگ ڈھل گئے تھے۔ انہی میں وہ خود بھی کہیں کھو گیا۔ آخری سٹاپ تک جب کہ کنڈیکٹر نے خود اسے اترنے کو کہا، اسے کسی بھی بات کا مطلق ہوش نہ رہا۔

سنٹرل پارک کے برابر ایک وسیع قطعہ زمین تھا۔ اس میں اڑوس پڑوس کی نوتعمیر شدہ عمارتوں کا ضائع شدہ تعمیراتی سامان اور دیگر کاٹھ کباڑ پڑا رہتا۔ ایک طرف کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پڑے رہتے جنہیں قریب ہر روز صبح میونسپلٹی کی گاڑیاں ڈھو کر لے جاتیں لیکن اگلے چند گھنٹوں ہی میں اڑوس پڑوس سے پھر سے اتنی غلاظت یہاں پھینک دی جاتی۔ شام کو دفتر سے لوٹتے ہوئے اسے ان ڈھیروں کے قریب زمین میں گڑے اونچے چوبی کھمبوں پر ایک بڑا اشتہاری بورڈ لگا دکھائی دیا جس پر روبی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس نے روبی کو دیکھا اور ٹھٹھک گیا۔ اس کا بہت بڑا چہرہ بورڈ پر اس کی طرف جھکا معلوم ہوا۔ اس کی بڑی بڑی گہری آنکھیں تھیں اور بھرے بھرے ہونٹ۔ اس بورڈ کو کل شام کے بعد، جب وہ یہاں سے گزرا تھا، کسی وقت لگایا گیا تھا۔ تصویر کے خط ایسی ہنرمندی اور مشاقی سے کھینچے گئے تھے کہ سانس لیتے ہوئے زندہ معلوم ہوتے۔ ہونٹوں کی سلوٹیں اور ان کے کناروں کے پاس باریک روئیں تک دکھائے گئے تھے۔ دہانہ معمولی سا کھلا ہوا اور سفید دانتوں کی باریک لکیر سی نظر آتی ہوئی۔ جبھی یہ لکیر گہری ہوئی، دہانہ کچھ اور کھلا، ہونٹ کھنچ گئے اور مسکراہٹ نے چہرے کے عضلات میں رنگ بھر دیئے۔ ہونٹوں میں خفیف سی جنبش ہوئی گویا ان سے کلام کے پھول جھڑ رہے ہوں۔ ان پھولوں کی مہک نے اسے بے کل کر دیا۔ وہ دو قدم بورڈ کے اور قریب ہو گیا۔ حتیٰ کہ اس کا کندھا چوبی کھمبے سے مس ہونے لگا۔ ہونٹوں میں پھر سے جنبش ہوئی۔ الفاظ کی سرسراہٹ گونجی۔ وہ پنجوں کے بل اونچا ہو گیا۔ بدن کی ساری طاقت جیسے اس کے کانوں میں سمٹ آئی تھی اور تمام حواس حس سماعت کے ساتھ آن لگے تھے۔ ''آئی لو یو۔'' وہ حیرت اور مسرت کے صدمے کے تحت دو قدم پیچھے ہٹا۔ تصویر کے ہونٹ ساکت تھے مگر ان الفاظ کی گونج اس کے کانوں میں بجتی رہی؛ اس کی روح کے تاروں کو چھیڑتی اور اس کے ذہن کو تھپتھپاتی ہوئی۔ 'دنیا ایسی پرکیف کیا ہمیشہ سے تھی؟ جیسی اب معلوم ہو رہی تھی' اس نے سوچا۔

رات کو اس نے روزنامچہ کھولا جس میں چند ہفتوں سے باقاعدگی سے لکھنے لگا تھا۔ تاریخ لکھی، ۱۳ جون ۱۹۹۷ء۔ نیچے قدرے بڑے حروف میں لکھا ''روبی کا اظہار محبت۔'' پھر دیر تک قلم ہاتھ میں لیے لکھنے کے لیے الفاظ سوچتا رہا۔ لیکن جوں جوں وہ سوچتا، فقرہ بنانے کی کوشش کرتا،

اسے اپنا ذہن اسی قدر مبہم اور غیر واضح معلوم ہوتا۔ وہ ڈائری پر جھک گیا اور لکھا ’’روبی نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔ بالکل غیر متوقع طور پر اور ایک خاموش سڑک کے کنارے۔ میں جانتا تھا ایسا ایک روز ہو گا۔ وہ بے پناہ محبت کرنے والی خاص لڑکی ہے۔ کاش وہ جان پاتی کہ میں بھی اسے کتنا پیار کرتا ہوں۔ کاش وہ۔۔۔۔۔۔۔‘‘ وہ لکھنا چاہتا تھا کہ کاش وہ اس کے پاس ہوتی، وہ اسے چوم لیتا۔ لیکن اس بات کو لکھا کیسے جائے۔ الفاظ ایسے ہوں جو اس بات کے زہر کو چوس لیں اور بس اتنا ہی کچھ باقی رہے جس قدر وہ کہنا چاہتا تھا۔ وہ کچھ بھی نہ لکھ سکا۔ بے دلی سے روزنامچہ بند کیا اور لیٹ گیا۔

تمام رات وہ پریشان خوابی کا شکار رہا۔ مختلف بے ربط خواب، بے سروپا اجزاء اور پریشان کن ترکیب والے۔ ان میں ان گنت مناظر تھے۔ کچھ دیکھے بھالے اور کچھ بالکل انجانے۔ ایک خواب اسے کچھ کچھ یاد رہا جو شاید اس نے رات کے آخری پہر میں دیکھا تھا۔ اسے یاد رہا خواب میں ایک تو اس گلی کا منظر تھا جہاں وہ پہلے کبھی رہا کرتے تھے۔ پھر اس نے دیکھا کہ وہ لارنس گارڈن میں کھڑا تھا۔ معلوم نہیں وہ سرخ و سفید رنگت والی لڑکی وہاں کیونکر پہنچی۔ خواب میں وہ اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ بائیس تیئس برس کی، اونچی لمبی، پتلی سی اور تیکھے نقوش والی لڑکی۔ پنجاب کی الھڑ مٹیار جیسی۔ اس نے لڑکی کا ہاتھ تھام کر پنجوں کے بل خود کو بلند کیا اور معمولی سا اوپر اچھالا۔ اگلے لمحے وہ لڑکی سمیت فضا میں بلند ہو چکا تھا۔ ہوا کے دوش پر تیرتے ہوئے وہ درختوں کے کنج سے پرے اپنے گھر کی چھت پر جا اترا۔ اسکی ماں گیلے کپڑے چھانٹ چھانٹ کر منڈیروں کے بیچ تنی نائلون کی تار پر پھیلا رہی تھی۔ دھوپ تیز تھی۔ وہ اسے ایک طرف کھڑا کر کے ماں کے قریب گیا اور ہولے سے اس کے کان میں کہا کہ وہ اس سے ملانے ایک لڑکی کو لایا ہے۔ جو اگر اسے پسند آ جائے تو وہ اس کی بہو بننے کو تیار ہے۔ وہ دونوں لڑکی کی طرف مڑے۔ لیکن وہ اپنی جگہ موجود نہیں تھی۔ اس کا دوپٹہ البتہ منڈیر پر لہراتا دکھائی دیا۔ وہ خود پرے کنج میں راہ کھو بیٹھی تھی اور مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ اسی لمحہ اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لڑکی کی آواز دیر تک اسے کانوں میں گونجتی سنائی دی۔ صبح دفتر جانے سے قبل اس نے روزنامچہ کھولا اور لکھا ’’میں نے رات ایک لڑکی کو دیکھا۔ بہت پیاری، گڑیا جیسی بھولی بھالی صورت والی۔ اس کا نام شاید راحیلہ تھا۔‘‘

(۳)

یہ وہی دن تھے جب شبستان ریستوران میں دوستوں سے اس کی ان بن ہوئی تھی اور اس نے وہاں جانا موقوف کر دیا تھا۔ تبھی ایک روز اس نے روبی سے ملنے کا ارادہ کیا۔ قریب ایک ہفتہ وہ اس ایڈورٹائزنگ ایجنسی کو تلاش کرنے میں سرگرداں رہا جس کے لیے وہ ماڈلنگ کرتی تھی۔ روبی کا ٹیلی فون نمبر حاصل کیا۔ وہ شہر کے پوش علاقے ناظم آباد میں رہتی تھی۔ اس بات نے اس کی جھجک کو مہمیز کیا۔ کاغذ کے ٹکڑے پر لکھا اور اس کی جیب میں پڑا ہوا یہ نمبر ایک عرصہ تک کن کھجورے کی مانند اس کے جسم میں اپنی ٹانگیں گاڑے اسے نوچتا کھسوٹتا رہا۔ آخر ایک روز اس نے جی کڑا کر کے ڈائیل گھمایا۔

فون کے دوسری طرف کھنکتی آواز اس نے فوراً پہچان لی۔ وہ روبی ہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی ’’جی۔ ہیلو، جی۔‘‘ اسے لگا روبی نہا کر آئی تھی۔ سر کے بالوں کو اس نے تولیے میں اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ پانی کے قطرے اس کے رخساروں پر مچل رہے تھے۔ ٹھنڈے پانی کی تازگی سے اس کا جسم

کھلا ہوا تھا۔ خود وہ ایک سڑک کے کنارے فون بوتھ پر کھڑا تھا اور تیز دھوپ نے اس کی کھوپڑی کو سڑک پر بچھی تارکول کی طرح پگھلا کر پلپلا کر دیا تھا۔ پسینے کی دھاریں اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی پر بہتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ٹریفک کا شور بہت دور سے آتا سنائی دے رہا تھا۔ دیر تک خاموش رہنے کے بعد، جس دوران تمام یاد کی ہوئی باتیں اس کے ذہن میں باہم خلط ملط ہو گئیں، وہ بس اتنا ہی کہہ سکا "میرا نام زمان ہے۔ مجھے تمہارا پیغام مل گیا تھا۔ میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔" پھر اس نے کچھ یوں کہنا چاہا کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے تا کہ وہ تمام تحفے اسے پیش کر سکے جو عرصہ سے اس کے لیے جمع کر رہا تھا۔ لیکن اس کا سانس اس قدر پھول گیا اور آواز گلے میں رندھ کر یوں پھنسنے لگی کہ وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ گڑبڑاہٹ کے ساتھ ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

اگلے ہی روز اسے ٹیلی فون کا جواب موصول ہو گیا۔

وہ ٹی وی دیکھتے ہوئے پیشاب کرنے کی نیت سے اٹھا۔ کمرے سے باہر نہ نکلا ہو گا کہ شیونگ کریم کے ایک کمرشل نے اس کے قدم روک لیے۔ سکرین پر ایک ٹھاٹھیں مارتے سمندر کا منظر تھا جس کی بلند موجوں کے بیچ ایک مرد دلیری کے ساتھ کشتی چلا رہا تھا۔ پھر منظر بدلا۔ وہی مرد عمدہ لباس میں ملبوس ایک خوبرو لڑکی کے ساتھ ساحل سمندر پر مست خرامی کر رہا تھا۔ وہ لڑکی روبی تھی۔ شام کا عمل تھا۔ پیچھے افق میں سورج کی سرخ ٹکیہ دہک رہی تھی۔ وہ دونوں بہت خوش تھے اور کسی بات پر سروں کو پیچھے گرائے ہنس رہے تھے۔ پانی کی موجیں ان کے پیروں میں مچل رہی تھیں۔ اس نے اشتیاق اور حسرت کے ملے جلے احساس کے ساتھ روبی کو دیکھا۔ وہ کسی شہزادی کی طرح دکھ رہی تھی۔ پر وقار، حسین اور شاہانہ۔ بس انہی لمحوں میں روبی نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور ٹھٹھک گئی۔ اپنائیت سے بھری مانوس مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر مچلی۔ وہ مستی میں گنگناتے ہوئے بولی "آئی لو یو ٹو زمان" اور آہستہ آہستہ منظر سے غائب ہو گئی۔ وہ مبہوت سا ٹی وی کی سکرین کو تکتا رہا جس پر اب ایک اور کمرشل چل رہا تھا جس میں اسے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر اس کا دل بھر آیا۔ آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ ایک نہایت پر گداز اور یاس بھری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھر آئی جو آہستہ آہستہ پورے چہرے پر پھیل گئی۔

یہ مسکراہٹ اس کے چہرے کا حصہ ہو گئی تھی۔ صبح بیدار ہوتا تو یونہی ہونٹوں پر سجی ہوتی۔ تمام دن ہمکتی رہتی اور تھکن کو اس کے قریب نہ پھٹکنے دیتی۔ گھر سے نکلتا یا لوٹتا تو یہ اس کے ہمراہ ہوتی۔ اس پر اپنا سایہ کیے رکھتی۔ دوپہر کی کڑکتی دھوپ میں وہ اپنے چہرے کو چھو کر دیکھتا۔ یہ اسے بہت تازہ لگتا۔ اسے لگتا کچھ بدل گیا تھا۔ دفتر کے کام میں اس کا جی خوب لگتا۔ بس سٹاپوں پر سواریوں کی بھیڑ، جھلساتی دھوپ اور سڑکوں پر گاڑیوں کے دھوئیں سے اب اسے الجھن نہیں ہوتی تھی۔ یونہی بیٹھا بیٹھا مسکراتا رہتا اور اونچی آواز میں فلمی گیت گنگناتا۔ کبھی دل میں ترنگ آتی کہ شبستان ریستوران جائے اور دوستوں سے ملے۔ آخر وہ مذاق ہی تو تھا۔ شاید وہ اپنے اس دن کے رویہ پر نادم ہوں اور محض جھجک کے باعث اس سے معذرت نہ کر پا رہے ہوں۔ کبھی اس کا جی کرتا وہ دفتر سے چھٹیاں لے کر شہر سے باہر کسی پر فضا مقام پر چلا جائے۔ چند دن اچھی آب و ہوا میں رہ آئے۔ وقت ختم ہو جانے کے باوجود دفتر میں بیٹھا رہتا۔ روز روز اوور ٹائم لگانے لگا تھا۔ مہینہ ختم ہوا تو اس کو اتنے پیسے ملے جو اس کی عمومی ماہانہ تنخواہ سے قریب دگنا تھے۔ وہ ہر اس شے کو خریدنے کی خواہش کرتا جس کے لیے روبی ماڈلنگ کرتی تھی۔ لیڈیز شوز، شیمپو، نہانے کا صابن، میک اپ کا

سامان، زیورات، ملبوسات' عورتوں کے پیڈز۔ تنخواہ ملنے پر جس قدر مقدور ہوتا، وہ یہ سب کچھ خریدتا۔ پھر انہیں رنگین کاغذ میں لپیٹ کر نئے کپڑوں کے اٹیچی کیس میں سینت سینت کر رکھتا۔ یہ سب وہ تحفے تھے، جنہیں وہ پہلی ملاقات میں روبی کو پیش کرنا چاہتا تھا۔ پہلی ملاقات جو اس کے لیے ایک کیف آور خوابناک خیال تھی۔ پھولدار وادیوں کی مہک سے معمور اور پہاڑی جھرنوں کی جلترنگ سے گونجتا ہوا خیال۔

روبی سے ملاقات تو نہ ہو سکی۔ ایک روز البتہ یہ پہلی ملاقات کی خواہش ہی باقی نہ رہی۔ خواتین ڈائجسٹ کے ایک شمارے میں روبی کا تفصیلی انٹرویو شائع ہوا تھا۔ سرورق پر اس کی رنگین تصویر موجود تھی جس میں وہ تنگ گھیرے والی بغیر بازو کے قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھی اور ایک منقش کرسی پر شاہانہ انداز میں بیٹھی تھی۔ بھرے بھرے برہنہ بازو اس نے اپنی چھاتیوں تلے باندھ رکھے تھے۔ بازوؤں کے حلقے میں چھاتیاں خوب ابھر آئی تھیں۔ اندرونی صفحات میں بھی کچھ تصاویر تھیں۔ سوئمنگ کاسٹیوم والی تصویر تو ان میں سب سے بڑھیا تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی ایک بار روبی کے انٹرویوز اس جریدے کی زینت بنے تھے۔ مگر اس بار اہتمام کچھ مختلف تھا۔ اس خاص سبب کا ذکر سرورق پر ہی ایک طرف جلی حروف میں کر دیا گیا تھا۔ تاہم اس سرخی کو وہ رسالہ کھنگال لینے کے بعد ہی کہیں پڑھ سکا۔ لکھا تھا ''روبی ساجن کے گھر سدھار چلی''۔ تفصیل اس خبر کی یہ تھی کہ روبی کی اپنے چاہنے والے ایک امیر زادے سے منگنی ہوئی تھی۔ شادی اگلے سال کے شروع میں متوقع تھی۔ انٹرویو کے ابتدائی حصہ میں ہی روبی کا یہ بیان جلی حروف میں چھپا تھا کہ یہ اس کی زندگی کا سب سے حسین واقعہ تھا۔ سارا انٹرویو اس نے نہیں پڑھا۔ اسے طبیعت میں بے چینی محسوس ہوئی اور اس نے رسالہ ٹھپ سے بند کر دیا۔ اس نے اپنے اس ارادے کو بھی فی الوقت ملتوی کر دیا کہ سرورق کو کاٹ کر اپنے بستر کے برابر والی دیوار پر چپکائے۔ دیواروں پر پہلے ہی اتنی تصویریں تھیں کہ مزید کسی تصویر کی گنجائش نکالنا خاصا دشوار تھا۔

اگلے روز وہ دفتر بھی نہ گیا۔ فون کر کے بیماری کا بہانہ کر دیا۔ تمام دن سویا رہا۔ کئی دنوں سے اسے اعصاب میں جو مدھم سی اینٹھن محسوس ہو رہی تھی' وہ یکبارگی شدید ہو گئی۔ ہلکا ہلکا تاپ بھی تھا۔ تاہم اس نے کوئی دوا وغیرہ نہ لی۔ بس سویا رہا یا بستر پر لیٹا اونگھتا رہا۔ تینوں وقت کا کھانا بھی اس نے بستر ہی میں کھایا جو اس کی ماں نے کالی مرچ اور گھی کی کم مقدار کے ساتھ بنایا تھا۔ کھا کر وہ پھر سے لیٹ جاتا۔ وقفے وقفے سے جاگ کھلتی۔ وہ لیٹا چھت کو تکتا۔ حتیٰ کہ آنکھیں بوجھل ہونے لگتیں اور نیند پھر سے غالب آجاتی۔ جاگن میٹی کا یہ کھیل تمام دن جاری رہا۔ رات کو ماں نے اسے گرم دودھ کا گلاس پلایا۔ اسے خوب کھل کر پسینہ آیا۔ تمام دن سوئے رہنے کے باوجود وہ رات کو دس ایک بجے کے قریب پھر سے گہری نیند سو گیا۔

آدھی رات کے قریب جاگا تو سر درد سے بھاری اور تالو خشک ہو رہا تھا۔ البتہ بخار باقی نہ رہا تھا۔ اس نے فریج سے ٹھنڈا پانی پیا۔ کچھ دیر چارپائی پر سے ٹانگیں نیچے لٹکائے بیٹھا رہا۔ درد میں کوئی افاقہ نہ ہوا تو اٹھ کر باہر چوبارے میں چلا آیا۔ آسمان صاف تھا۔ ستارے جگر جگر چمک رہے تھے۔ ہوا رکی ہوئی تھی البتہ وقفے وقفے سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا چہرے سے ٹکراتا تو جسم میں سرور کا احساس بیدار ہوتا۔ رفتہ رفتہ درد کی شدت میں کچھ کمی محسوس ہوئی۔ اسے خیال آیا کہ بہت دنوں سے پان نہیں کھایا۔ سونف سپاری والا میٹھا پان جو وہ کبھی کبھار منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے دفتر سے لوٹتے ہوئے منہ میں ڈال لیتا اور پھر پیک اگلے بغیر چباتا رہتا۔ اسے کئی سال پہلے کا ایک منظر یاد آیا جب کالج کا ٹور کاغان گیا تھا۔ فرحان بھی اس ٹور میں شامل تھا۔ خاص نستعلیق اردو بولنے والا جس کے تمام گھر والے پان کے رسیا تھے۔ وہ کوئی دو ایک سال پہلے اپنے گھر ہی میں بجلی کا شاک لگنے

سے چل بسا تھا۔ تب اسے لیکچرر مقرر ہوئے سال بھر بھی نہ ہوا ہو گا۔ لیکچرر شپ اس کا خواب تھی۔ تب وہ کتنا خوش تھا۔ پہلے دن جب اس نے کلاس میں لیکچر دیا تو دوستوں کو پارٹی دی جس میں سب نے خواب شراب لنڈھائی۔ وہ خاموش طبع خوبرو نوجوان تھا۔ اس کے خیال نے اسے دل گرفتہ کر دیا۔ پھر شاید ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کا اثر تھا یا رات کے اس پہر کا اس پر عمل ہوا کہ اس کو اپنا دل درد سے بھینچا ہوا اور یکلخت بہت بھاری محسوس ہوا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے یوں بہنے لگے جیسے تیز بارش میں چھت کے کمزور حصے سے پانی ٹپکنے لگتا ہے۔

اگلے دن دفتر جاتے ہوئے اس نے اپنے چھوٹے اٹیچی کیس جیسے سرخ تھیلے میں سے دل بہار چائے کی تھیلیاں نکال کر میز کی دراز میں ڈال دیں۔ جب سے دن میں دس دس مرتبہ چائے پینی شروع کی تھی اس کے مثانے کی حالت زبوں تھی۔ سر میں درد کی شکایت اس پر مستزاد تھی اور بار بار پیشاب کی حاجت محسوس ہوتی۔

بہت خاموشی کے ساتھ وہ پھر سے ریستوران میں صرف دو پہر کے کھانے کے لیے جانے لگا۔ ملک صاحب نے معمول کی غیر متوقع تبدیلی پر استفسار کیا تو وہ بے نیازی کے ساتھ کندھے اچکا کر بولا "بس ایویں۔ منہ دا ذایقہ بدلن لئی۔" تاہم پھر یہ بات بھی معمول ہو گئی۔

یوں بہت سے دن گزر گئے۔ ویسے ہی یک رنگے اور حبس زدہ یکسانیت کے ساتھ۔

ایک روز دو پہر کو وہ ریستوران میں بیٹھا دال چاول کھا رہا تھا جو اس کا من بھاتا کھاجا تھا۔ ساتھ ساتھ دائیں جانب کاؤنٹر کے عقب میں دیوار پر لگے بڑے حجم کے رنگین پوسٹر کو بھی تکتا۔ ملک صاحب نے اسے یہاں گاہکوں کی تفریح طبع کے واسطے لگا چھوڑا تھا۔ یہ کسی ٹیٹرا پیک جوس کا اشتہار تھا۔ برف کی مہین تہہ میں لپٹے ہوئے ٹیٹرا پیک' جس پر نمی اوس کے قطروں کی صورت میں چھلک رہی تھی' میں نلکی ڈالے دو لڑکیاں مزے سے جوس پی رہی تھیں۔ ان کے چہرے جوس کی ٹھنڈک اور ذائقے سے فرحاں تھے۔ ان میں سے ایک کو وہ پہچانتا تھا۔ وہ شاہینہ تھی' ایک سینئر ماڈل' مدھرے قد کی ذرا فربہ سی۔ دوسری شاید کوئی نئی تھی۔ لیکن ایسی نئی بھی نہیں تھی۔ اس نے بس چند لمحے غور کیا اور اسے یاد آیا۔ وہ ہو بہو اس کے خواب کی لڑکی راحیلہ تھی۔ عین عین وہی۔ نرم و نازک کتابی سا چہرہ جس پر معمولی سی جھینپ، اداسی اور گھبراہٹ کا تاثر تھا۔ آنکھیں چمکتی ہوئی سی اور روشن، بال گھنگھریالے اور بظاہر بنا سنورے معلوم ہوتے مگر بھلے لگ رہے تھے۔ حیرت و مسرت سے اس کے سانس کا زیر و بم بے باقاعدہ ہو گیا۔ جیسے خواب حقیقت ہو گیا ہو۔

اسی رات اس نے خواب میں اس لڑکی کو درختوں کے راہ الجھا دینے والے پیچ دار اور تاریک کنج سے باہر نکال لیا۔ صبح دفتر جانے سے پہلے روزنامچہ میں لکھا "میں نے راحیلہ کو کنج کی بھول بھلیوں سے نکال لیا جہاں وہ اپنی ہی غلطی کی وجہ سے جا پھنسی تھی۔ وہ اتنی خوش تھی کہ بس روئے جاتی تھی اور سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کس طرح میرا شکریہ ادا کرے اور کیا کہے۔ ہم نے طے کیا ہے کہ وہ پھر کبھی اس کنج کا رخ نہیں کرے گی۔ اور اگر ایسی کوئی افتاد آ ہی پڑی تو کیا اب میں اسے اکیلے کہیں جانے دوں گا۔"

عہد گزشتہ کی ایک کہانی

قیاس ہے کہ یہ کہانی سورج کے روپوش ہو جانے کے واقعہ کے کوئی چند ایک سال بعد تحریر کی گئی۔

گذشتہ تہذیب کے لوگ، جو طلوع آفتاب کے شاہد تھے، ہم میں نہیں رہے۔ لیکن ان کے بارے میں ہم نے کافی کچھ پڑھ اور سن رکھا ہے۔ وہ افسردہ اور خاموش طبع لوگ تھے۔ ان کی زندگیاں بے اطمینانی سے عبارت تھیں۔ خاص طور پر سورج کے روپوش ہو جانے کے بعد وہ، بچے بوڑھے جوان، سبھی اگلی نسلوں سے اپنا کوئی دکھ بانٹے بغیر ہی چٹ پٹ صاف ہو گئے۔ اسی نسل کے ایک فرد نے اس کہانی کو تحریر کیا۔ میں اس کے بعد کی تقریباً ساتویں نسل سے متعلق ہوں۔

''فسانۂ عجائب'' کی تیسری جلد میں، جسے میں نے اردو بازار کے ایک کباڑیے سے خریدا تھا، استر کے ساتھ چند صفحات خالی رہ گئے تھے، انہی پر کہانی کو لکھا گیا۔ خط شستہ اور نستعلیق تھا۔ الفاظ باریک' قدرے دائیں طرف جھکے ہوئے، جیسے سطح آب پر کشتی ہچکولے کھاتی ہے اور نسائیت سے مملو محسوس ہوتے۔ لیکن سب کچھ بے ہنگم تھا۔ لکیریں آڑھی ترچھی، ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئیں اور تیزی قلم سے الفاظ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے ہوئے۔ کاغذ خستہ تھا، ہلکے سرخی مائل بھورے رنگ کا جیسے آگ میں تپایا گیا ہو۔ اس میں سے بوسیدگی اور برساتی سیلن کی ہمک اٹھتی تھی۔ سیاہ روشنائی کہیں کہیں مدھم ہو کر پھیل گئی تھی تاہم لفظ شناخت ہو جاتا تھا۔

مصنف کے اپنے بیان کے مطابق یہ کہانی ایک حقیقی واقعے پر مبنی ہے۔ شاید اسے کہانی کہنا ہی درست نہ ہو۔ یہ ایک شخص کی یادداشت کے چند بے ترتیب اجزاء ہیں۔ ایک افسوس ناک واقعے کی روداد بیان کی گئی ہے، جو غالباً نامکمل ہے۔ خاص طور پر کچھ ابتدائی حصہ ناپید ہے۔ مصنف سبھی وقوعات کا، جیسا کہ ظاہر ہے، عینی شاہد نہیں۔ بیشتر واقعات کو اس نے ماضی کے آئینے میں چشم تصور سے دیکھا اور رقم کر دیا۔ اخیر میں صفحے کے ایک کونے میں کہیں زیادہ باریک لکھائی میں ایک پس نوشت مرقوم تھا جسے جوں کا توں اسی مقام پر دکھایا گیا ہے۔ آغاز کچھ یوں ہوتا ہے۔

''..........وہ جاگا تو ابھی رات ہی تھی۔

اس نے اپنی چھاتی پر پڑے ان دیکھے بوجھ کو پرے دھکیلا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ شاید کوئی خواب دیکھا تھا، اس نے گھمبیرتا کے ساتھ سوچا۔ گذشتہ خواب کے چند مبہم اور لاتحلیل اجزا ذہن میں باقی تھے۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور روشن دان سے دبے پاؤں کمرے میں اتر رہی تھی۔ کلائی میں بندھی گھڑی میں، جسے پہنے ہوئے ہی وہ سو گیا تھا، اس نے وقت دیکھا۔ سوئیاں گیارہ بیس بتا رہی تھیں۔ اسے اپنا جسم بخار میں پھنکتا محسوس ہوا۔ وہ پھر سے لیٹ گیا۔ ہر رات اسے تھکن سے یونہی تاپ چڑھنے لگتی تھی۔ اس نے یاد کیا۔ رات کو جب وہ گھر لوٹا تو بارہ ساڑھے بارہ کا عمل تھا۔ لباس تبدیل کرنے اور بستر پر لیٹنے میں کوئی پندرہ بیس منٹ لگے ہوں گے۔ ایک بجے کے بعد ہی وہ سویا ہو گا جیسا کہ اس کا معمول تھا۔ ''شاید گھڑی خراب

ہے‘‘اس نے سوچا۔

دائیں جانب روشن دان کے کانچ کے پردے کے عقب میں گہری تاریکی تھی۔رات کے تیسرے پہر کا سماں تھا۔یوں اچانک جاگ اٹھنے سے اس کی آنکھوں سے نیند یکسر کافور ہوگئی تھی اور دوآبہ خشک تھا۔وہ چت لیٹا آنکھیں مچھا تا چھت کو تکا کیا۔

’’سوئیاں اپنا ایک چکر مکمل کر کے گیارہ پر تھم گئی تھیں۔‘‘اس نے قیاس کیا’’اگر گھڑی خراب نہیں تو رات کو ایک بجے سونے کے بعد گیارہ بجے بیدار ہونے کا مطلب تھا، دن چڑھ آیا تھا۔نہیں،یہ اگلی رات تھی یا اس سے اگلا دن یا۔۔۔۔۔‘‘دوآبہ پھر سے تر ہونے لگا۔وہ نینداور بیداری کے بین بین جھولتا رہا۔اس بیچ اسے تیز آندھیوں کا شور سنائی دیا‘دور دراز تاریک گپھاؤں سے آتی بدروحوں کی چیخوں سے مملو شور۔پھر وہ مکمل جاگ اٹھا۔اسے کمرے میں چوہوں کی سرسراہٹیں سنائی دیں۔وہ بغور سننے لگا۔آوازیں بہت مدھم تھیں جیسے سناٹے میں دور جھینگر سیں سیں کر رہے ہوں۔کچھ دیر خاموشی رہی۔آواز پھر سے پیدا ہوئی۔اس بار زیادہ قریب سے۔’’سیں۔سیں۔سوں۔سیں۔ں۔ں۔ں‘‘جیسے چوہے تعداد میں زیادہ تھے۔تب اس نے پہلی بار چوہے کو دیکھا،بلی جیسے جسم کا۔پچھلے دو پیروں پر بیٹھا یا کھڑا تھا اور خون آلود دانتوں میں گوشت کا لوتھڑا چبا رہا تھا جو اس نے اس کے خونم خون انگوٹھے سے نوچا تھا۔اسے دیکھ کر چوہا یک لخت ساکت ہوگیا اور ایک ٹک اسے تکنے لگا۔اس نے بسرعت دونوں پیر کھینچ کر سمیٹے۔گوشت اتنا نوچا گیا تھا کہ انگوٹھے کا نصف ناخن ننگا تھا۔چوہا لوتھڑے سمیت بستر سے نیچے تاریکی میں کودا اور چمپت ہوگیا۔کچھ دیر اس کی بگٹٹ بھاگنے کی سرسراہٹ گونجتی رہی پھر وہ بھی تھم گئی۔

بہت سا خون پائنتی پر جما تھا اور گھاؤ سے ہنوز رس رہا تھا۔اس نے سر آگے لا کر دیکھا۔گھاؤ گہرا اور تازہ تھا۔چینڈے میں خون رنگی سفیدی جھلک رہی تھی۔ایک حیرت بھری سیٹی اس کے نرخرے سے نکلی’’آدم خور‘‘وہ طیش سے بڑبڑایا’’حرام زادے۔‘‘

بستر کی پٹی پر ہاتھوں سے اپنا بوجھ ڈال کر وہ نیچے اترا۔اردگرد چیزوں کا سہارا لیتا اور ایک پیر پر گھسٹتا وہ خود کو غسل خانے تک لے گیا۔اس مشقت سے اس کا سانس پھول گیا تھا۔آنکھوں سے پانی،خون سے زیادہ مقدار اور تیزی سے بہہ رہا تھا۔وہ بیسن سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ہاتھ بڑھا کر دیوار گیر سے فرسٹ ایڈ کا ڈبہ نکالا۔اسے کھولا۔روئی سے انگوٹھے پر سے خون اور باریک لوتھڑے صاف کیے۔گھاؤ میں سرخ ٹنکچر آیوڈین کا چس دیا اور اوپر روئی کا پھوہا جما کر رکھ دیا تا کہ خون کا اخراج تھم سکے۔

بستر تک واپس پہنچتے ہوئے اس کا دم اکھڑ گیا۔سانس کی نالی کو کسی نے اس زور سے بھینچ دیا تھا کہ سیٹی سی بجنے لگی۔دل کسی منہدم ہوتی دیوار کی مانند ڈھے رہا تھا۔دیر بعد تنفس بحال ہوا۔’’ٹنکچر سے آرام آجائے گا۔‘‘اس نے خود کو دلاسہ دیتے ہوئے سنا۔اسے یاد آیا اسی عمارت کے پانچویں درجے میں ایک کہنہ سال ادھ گنجا ڈاکٹر مقیم تھا۔اس کا نام کچھ مشکل سا تھا۔اس سے بس معمولی سی علیک سلیک تھی جو سیڑھیاں چڑھتے یا اترتے ہوئے اتفاقی مڈبھیڑ کا نتیجہ تھی۔معلوم نہیں اس وقت وہ سویا ہو یا ممکن ہے گھر پر ہی موجود نہ ہو۔چار زینے چڑھ کر اوپر جانا ایک رسک تھا۔بہتر تھا وہ صبح ہونے کا انتظار کرے جو بس ہوا ہی چاہتی تھی۔

اس نے بستر کے برابر تپائی پر دھرا لیمپ جلا دیا تا کہ روشنی میں چوہوں کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھی جا سکے۔وہ اسے دکھائی تو نہ دیئے لیکن وہ

آس پاس ہی کہیں موجود تھے۔ ان کے پیروں کی سرسراہٹیں اسے برابر سنائی دے رہی تھیں۔

''شاید انہوں نے دیواروں میں گھر بنا لیے ہیں۔''

سال بھر پہلے اس نے کمرے میں سامان کی ترتیب بدلتے ہوئے اس کا کونہ کونہ چھان مارا تھا۔ اسے کہیں کسی جانور کے بل کا نشان نہیں ملا۔ ''ایسا محفوظ کمرہ کیا کسی کا ہوگا۔'' تب اس نے مسرت سے سوچا تھا۔ بستر کے سرہانے کے برابر دیوار میں البتہ ایک سوراخ تھا لیکن جو اتنا تنگ تھا کہ اس کے دہانے میں اس کی چھنگلی بھی داخل نہ ہو سکی تھی۔ جیسے دو اینٹوں کے بیچ سیمنٹ کی چیپٹی اکھڑنے سے خلا بنا ہو۔

اسے سر میں ہلکا سا چکر محسوس ہوا اور نیم بے ہوش سا پیچھے بستر پر جا گرا۔ ''ویسا جسیم چوہا تو اس میں داخل ہونے سے رہا۔'' پھر کچھ سوچ کر اس نے خود کو بلند کیا اور بیٹھ گیا۔ ہولے ہولے سرکتے ہوئے خود کو بستر سے نیچے اتارا۔ بدقت دیوار کے سوراخ تک آیا۔

''یہ تو ننھے کیڑوں کا بل ہے۔'' خود کو جھکا کر اس نے دہانے میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا چہرے سے ٹکرایا جیسے یہ سوراخ دیوار سے پرے راہداری تک سرکتا چلا گیا ہو۔ جیسے یہ محض ننھے کیڑوں کی کارستانی نہ ہو۔ جیسے کسی نے عمداً اسے دیوار کے آر پار چھیدا ہو۔ وہ زخمی پیر گھسیٹتا دروازہ کھول کر باہر راہ داری میں آ گیا۔ سوراخ کے مقام پر دیوار کا جائزہ لیا۔ وہاں سیمنٹ کی بے داغ موٹی تہہ پر ہرے رنگ کی قلعی پھری ہوئی تھی۔ آس پاس بھی دیوار صاف تھی۔ راہداری گم سم اور پرسکون تھی۔ پاس ہی، جہاں سے زینہ نیچے جانا شروع ہوتا، کوڑے کرکٹ سے بھرا سیاہ ڈرم دھرا تھا۔ اردگرد بند کمروں میں سے چند ایک میں روشنی ہو رہی تھی۔ باہر سڑک پر نومولود ٹریفک ہمک رہی تھی۔

واپس مڑنے کی کوشش میں وہ کچھ لڑکھڑا گیا۔ اب اس سے پیر گھسیٹا بھی نہیں جاتا تھا۔ جیسے کچھ تھا جو اس کے پیر کے انگوٹھے سے باہر پھوٹ بہنا چاہتا اور پوست کے تلے کلبلا رہا تھا۔ واپس بستر پر پہنچتے تک زخم کھل چکا تھا۔ پیر درد سے اینٹھنے اور گھاؤ سے خون پھر سے رسنے لگا تھا۔ وہ بے حرکت چت لیٹ گیا۔ پانچویں درجے میں مقیم ڈاکٹر اور غسل خانے میں پڑا فرسٹ ایڈ کا ڈبہ اب بہت دور تھے۔ وہ یونہی کھلے دہانے سے خون کو رستے ہوئے دیکھا کیا۔ پیر ٹخنوں تک سوجا ہوا تھا اور پنڈلی کی رگیں تن کر باریک ہریالے سانپ بن گئی تھیں۔

اپنے زخم کی سنگینی کا اندازہ کر کے اس نے خوف سے تھوک نگلی۔ اسے نرخرے تک استفراغ کا دباؤ محسوس ہوا۔ ہونٹوں پر نمکین اور کھٹاس بھرا ذائقہ ابھر آیا۔ وہ سوچنے لگا، بچپن میں اسے جانوروں سے کتنا انس تھا۔ خونخوار درندوں سے بھی جو کارٹون فلموں میں انسانوں کی طرح باتیں کرتے اور ناچتے گاتے تھے۔ سبھی اس کے دوست تھے۔ شیر خان ایک جابر شیر، کمانڈر الفانتو ایک فوجی ہاتھی، سابینو ایک بانکا ریچھ جو گلے میں لال رومال باندھتا تھا اور ریٹا ایک سنجیدہ روچھیا۔ ٹونی بلیئر، ڈاکی ڈک، پوپائے دی سیلر کا طوطا۔ یہ سب اس کے خوابوں کے بھی ساتھی تھے۔ وہ ان کے ساتھ خطرناک مہمات سر کرتا۔ بڑی بڑی جنگیں لڑتا۔ لیکن چوہے کبھی اسے ایک آنکھ نہ بھائے۔ لمبوتری بدہیئت شکل والے کمینے جانور ایسی بے شرمی سے دانت نکالتے کہ انہیں مار دینے کو ہی جی چاہتا۔ مکی ماؤس کی شرارتیں اسے بالکل نہ بھاتی تھیں۔ وہ اپنی کریہہ مونچھیں مروڑتا تو وہ نفرت سے اپنا چہرہ ٹی وی سے ہٹا کر صوفے پر بیٹھے اپنے باپ کی طرف پھیر لیتا جو ہمیشہ دفتر سے لوٹ کر یہاں بیٹھ جاتا اور منہ میں کچھ چباتا اور کتاب پڑھتا رہتا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر تپائی پر سے ریموٹ کنٹرول اٹھایا اور ٹی وی آن کر دیا۔ ایک کتابی چہرے والی سانولی سی جواں سال نیوز کاسٹر

امریکہ میں ہونے والے بم دھماکیوں کی تفصیلات بتا رہی تھی۔ کہیں نہ کہیں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ خوامخواہ کا شور شرابہ۔ اس نے نہایت بے زاری کے ساتھ سوچا۔ سکرین پر تصویری رپورٹ چلنے لگی تھی جو اسے لگا وہ پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا۔ جلی ہوئی عمارتیں، اعضاء بریدہ لاشیں، فائر بریگیڈ کا عملہ اور خوفزدہ تماشائی۔ گاہ گاہ نیوز کاسٹر لڑکی سکرین پر جلوہ افروز ہوتی۔ اس نے عدم توجہی سے لڑکی کے جامنی رنگ کی لپ سٹک میں لتھڑے ہونٹوں کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ننھے منے مہاسے تھے جنہیں پاؤڈر کی تہہ تلے چھپایا گیا تھا۔

پھر وہ سورج کے روپوش ہو جانے کی کتھا سنانے لگی۔ مختلف افراد کے فلمبند کیے گئے تاثرات بھی دکھائے گئے۔ زیادہ تر لوگوں کے تاثرات حیرت اور خوف، یقین و بے یقینی کے احساسات کے تحت مبہم تھے۔ کچھ نے پرامید ہونے کا سوانگ بھرتے ہوئے کہا کہ سورج تو اپنے معمول کے عین مطابق طلوع ہو چکا ہے۔ اس کی روشنی ایک غیر مرئی دبیز غلاف نے جذب کر رکھی ہے جو زمین کے گرد تنا ہوا ہے جب کہ چاند اپنی پوری آب و تاب سے آسمان پر چمک رہا ہے۔ جلد یا بدیر یہ غلاف ہٹ جائے گا اور پھر سے دن نکل آئے گا۔ مذہبی طبقے نے اس واقعے کو الٰہی قہر سے تعبیر کیا۔

سب سے دلچسپ رائے معروف مورخ اور ماہر آثار قدیمہ جی ایم شاہ نے دی۔ اس نے خیال ظاہر کیا کہ یہ واقعہ ایک کائناتی معمول کا حصہ ہے۔ تمام قدیم تہذیبوں میں سورج کی موت اور حیات نو کے خیال پر اعتقاد پایا جاتا ہے۔ ویدوں میں ایسے ہی ایک وقوعے کا ذکر ہے جب ایک ہندو دیوتا ''گنیش'' نے سورج کو نگل لیا تھا اور دنیا تاریک ہو گئی تھی۔ اس نے قیاس ظاہر کیا کہ اس وقوعے پر تحقیق سے ہم اس قابل ہو سکتے ہیں کہ سورج کے عرصہ حیات کا تعین کر پائیں اور یہ جان لیں کہ کب ایک خاص مدت کے بعد یہ بوڑھا ہو کر بلیک ہول بن جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا سورج لے لیتا ہے۔

مال روڈ کی ایک مارکیٹ میں اشیائے خورد و نوش خریدتی ایک فربہ اندام بوڑھی عورت نے ہچکیاں لے کر روتے ہوئے بتایا کہ اسے کئی روز پہلے خواب میں اس واقعے کی بشارت ہو گئی تھی۔ بس ڈر کے مارے چپکی رہی۔ ایک حال مست نوجوان راہگیر نے کندھے اچکائے اور کہا ''مجھے تو رات ہی پسند ہے، اچھا ہوا۔'' سیاست دان مشوش تھے کہ اگلے ماہ پیش کیا جانے والا چار کھرب 31 ارب 22 کروڑ کا خسارے والا بجٹ مزید التواء سے دوچار ہو جائے گا۔ سرکاری اہل کاروں نے ملک بھر میں بجلی کی افزوں مانگ پر فکرمندی کا اظہار کیا کیونکہ بجلی پیدا کرنے والے ایسے تمام یونٹ بند ہو چکے تھے جن کی اساس شمسی توانائی تھی۔

''گھڑی کا وقت غلط نہیں تھا۔'' اس کی کرب سے بھنچی ہوئی آنکھیں لڑکی کی آنکھوں میں گم ہو گئیں۔ اسے لگا کہ لڑکی کی زبان کچھ اور مگر آنکھیں کچھ اور بول رہی تھیں جو اس کے لیے قابل فہم نہیں تھا، کم از کم اس وقت نہیں۔ درد کا باریک تار اس کے پیر کے زخم سے دماغ کے وسط تک تنا ہوا تھا۔ یہ تار سکڑتا جاتا تھا اور ساتھ ساتھ جیسے وہ خود بھی۔ لڑکی موسم کا حال بتا رہی تھی۔ کھڑکی کے بند پٹوں پر بارش کی بوچھاڑ جلترنگ بجا رہی تھی، شڑ، شڑ، شڑ، شڑ، شڑ۔ ''جمعرات کی جھڑی ہے۔'' وہ سوچنے لگا۔ درد کے بھاری احساس تلے کہیں اسے بھوک محسوس ہوئی۔ اگر یہ دن ہوتا، یا کم از کم وہ زخمی نہ ہوتا تو نیچے بازار میں تلوں والا گرم نان پیڑوں والی لسی کے مکھن اور تلچھٹ سے لگا کر کھاتا۔ ''اخبار'' اخبار فروش نے صدا لگائی۔ ایک اخبار کمرے

کے دروازے کے نیچے جھری سے اندر سرک آیا۔

اس نے گردن پھرا کر نقاہت سے دروازے کی اور دیکھا۔ خود کو حرکت دینے اور کھسکا کر بستر سے نیچے اتارنے میں اسے بڑی دشواری ہوئی۔ ضعف کی شدت سے نڈھال جسم کو اس نے یخ دیوار سے ٹیک دیا اور اخبار کھول کر سامنے پھیلایا۔ نقاہت نے اس کی آنکھوں کے آگے دھندلا پردہ تان دیا تھا۔ باریک حروف والی سطریں آپس میں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ شہ سرخیاں اور تصویریں باہم گتھم گتھا ہونے لگیں۔ ٹیلی ویژن کی آواز دور سے آتا ہوا ناقابل فہم شور معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن یہ شور تنہا نہیں تھا۔ ٹریفک کا ہنگام، باہر راہ داری میں قدموں کی تیز ہوتی چاپ، اس کے دل کی دھک دھک، کانوں میں بجتی سائیں سائیں اور بہت سے چوہوں کی ''سیں سیں سیں'' جو اسے دکھائی نہیں دے رہے تھے، یہ سب آوازیں ایک بڑے دھارے میں ضم ہو گئی تھیں۔ بہت سی دھندلاہٹوں میں ٹی وی کی سکرین دور سے دکھائی دیتا ہوا ایک منظر تھی۔

اس کے پسندیدہ ''ٹام اینڈ جیری'' کارٹون چل رہے تھے۔ ٹام کے بازو اور ٹانگیں الگ الگ دو برعکس سمتوں میں بھاگتے ریل کے ڈبوں سے بندھی تھیں جو اسے اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ وہ ربڑ کے گڈے کی طرح دراز ہوتا اور پھیلتا جاتا تھا، خود اس کے اپنے جسم کی طرح جو کھال کے اندر ہی اندر ہزاروں میل کے بعد میں کھنچ رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے پھیلی سبز روشنی میں گم ہوتے منظر میں اس نے دھماکے کی آواز سنی۔ یہ آخری آواز تھی جو وہ سن سکا۔ دونوں ڈبے ٹام کو کھینچتے ہوئے پہاڑی کے عقب سے گھوم کر ایک دوسرے کے سامنے آ گئے تھے۔ سطح آب پر تیرتی روشنی میں فقط جھلملاتے عکس باقی بچے تھے جو بتدریج دھندلا رہے تھے۔

''تین دن بعد کمرے سے اٹھتے تعفن نے ارد گرد مکینوں کو مجبور کیا کہ وہ نیچے بیسمنٹ سے مجھے بلائیں۔ میں اس عمارت کے مالکان کا کارندہ خاص ہوں۔ ہر مہینے مکینوں سے کرایہ اگاہتا اور ہر طرح کے انتظامی امور و عمارت کی دیکھ ریکھ وغیرہ کا ذمہ دار ہوں۔ دو گھڑی دن رہے پولیس کی موجودگی میں دروازہ توڑا گیا۔

رینگنے والے ان گنت کیڑوں اور مکھیوں نے لاش کو سر تا پا ڈھانپ رکھا تھا۔ سپاہیوں کے اندر داخل ہونے پر بھی جانور منتشر نہ ہوئے، بلکہ احتجاجاً زیادہ شدت سے بھنبھنانے لگے۔ چوہوں نے مردے کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ کمرے میں جا بجا ان کے پنجوں کے سیاسی مائل سرخ نشان تھے۔ گویا کوئی بپھرا ہوا غول ہر سو دندناتا پھرا ہو۔ لاش کے گرد بڑے حلقے میں فرش پر سیاہ خون کی پپڑی جمی تھی۔ پہلو میں چار روز پرانا خون آلود اخبار دھرا تھا۔ پولیس نے مسخ شدہ لاش سمیت تمام اسباب اپنی تحویل میں لے لیا۔ میں نے کرایہ داروں کا ضخیم بہی کھاتا کھولا۔ مرنے والے نے اپنے کسی عزیز وارث کا نام نہیں لکھوایا تھا۔ لیکن وہ لاوارث نہیں تھا۔ اس کی اپنے وارثوں سے بنتی نہیں تھی۔ ایسا ایک بار اشارۃً اس نے خود مجھے بتایا تھا۔ ایک عورت بھی کبھی کبھار اس سے ملنے آتی تھی۔ لیکن میں اس بارے میں مزید کچھ نہیں جانتا۔ وہ ایک خوبصورت عورت تھی اور میرا خیال ہے دونوں کے درمیان جسمانی تعلقات بھی تھے۔ خیر یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ شاید اخبار میں اس کی تصویر چھپوا دینے سے اس کے کسی رشتہ دار کا سراغ مل سکے۔ لیکن اشتہار کے پیسے کون دے گا۔ پھر اتنے تردد کی ضرورت ہی کیا ہے؟

ایک لانڈری کا بل بھی اس کی طرف واجب الادا ہے۔ ابھی پولیس کی تحقیق جانے کیا گل کھلائے۔ میں نے کرایہ داروں کی فہرست سے اس کا نام خارج کر دیا ہے۔

سرکاری تفتیش کچھ عرصہ جاری رہنے کے بعد بے نتیجہ ہی اختتام پزیر ہوئی۔ بعدازاں میں نے فلیٹ کو فنائل کے پانی سے اچھی طرح دھلوایا اور دروازے کے باہر 'کرایہ کے لیے خالی ہے' کا بورڈ لگوا دیا ہے۔"

مسودے کا تسلسل یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ایک مزید صفحہ ان کاغذوں میں پڑا ہوا ملا ہے۔ مجھے لگا یہ صفحہ بھلے ہی اس تسلسل کا حصہ نہیں ہے لیکن ہے اسی روداد سے متعلق۔ سو اسے الگ سے یہاں پیش کر رہا ہوں۔" (مرتب)

'جب سے سورج روپوش ہوا ہے چوہوں کے ایک سفاک غول نے شہر بھر میں غدر مچا رکھا ہے۔ لوگ اتنے خوف زدہ ہیں کہ حفاظتی انتظامات کے بغیر گھروں سے باہر نہیں نکلتے۔ ہر روز دس بیس افراد کے چھیج جانے کی خبر ملتی ہے۔ عدم تحفظ اور بے یقینی کے دیو نے ہر سو تباہی اور ویرانی پھیلا دی ہے۔ ہر تھوڑے عرصہ بعد دواز ساز ادارے چوہے مار ادویات کو زیادہ مہلک بنا دیتے ہیں لیکن جانور زود آشنا ہیں۔ جلد خوگر ہو کر انہیں بے اثر کر دیتے ہیں۔ دیکھنا چاہیے کہ انسانوں اور جانوروں کی چپقلش میں نقصان کس کا ہے۔ ظاہر ہے دونوں کا، جبکہ فائدہ دواساز اداروں کا ہوگا یا کسی تیسرے غیر معلوم فریق کا۔ سو بہتر ہے کہ دونوں فریق آپسی جنگ وجدل سے تائب ہو کر ایک جگہ مل بیٹھیں اور کچھ طے کر لیں۔

ہم تھک چکے ہیں۔ شاید ہم ان کا مقابلہ کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ ہم سے اپنا دفاع بھی نہیں ہو پا رہا ہے۔ ہم اس مخلوق شی سے مزید الجھنا نہیں چاہتے۔ اس کی روز افزوں قہرناکی سے پناہ چاہتے ہیں جس کا بس ایک ہی حل ہمیں سمجھ میں آتا ہے کہ جاگتے رہیں۔ یہ جانور خوابیدہ لوگوں کو شکار کرتے ہیں اور جاگتے ہوؤں کے سامنے نہیں آتے۔

پژمردہ اور زبوں اعصاب کے ساتھ ہم نے اس مسئلہ کا حل وقت کی ایک نئی وضع کی تقسیم کی صورت میں نکالا ہے جو دن اور رات کی تخصیص باقی نہ رہنے کے بعد ناگزیر بھی تھی۔ ہر بارہ گھنٹے کے بعد تمام اہم سرکاری عمارتوں پر نصب طبل بج اٹھتے ہیں۔ ٹی وی، ریڈیو پندرہ سیکنڈ کے وقفہ قلیل کے لیے اپنی نشریات منقطع کر کے اسی طبل کی دھن بجاتے ہیں۔ لوگ اپنے کیلنڈروں پر ایک تاریخ آگے بڑھا لیتے ہیں۔ نئے دن کا آغاز ہوتا ہے۔ سریع الرفتار سوئیاں کہیں زیادہ شتابی سے اپنا اگلا چکر پورا کر لیتی ہیں۔ پھر سے طبل بجتے ہیں۔ پچھلے دن کا کام ابھی اختتام کو نہیں پہنچتا کہ نیا دن شروع ہو جاتا ہے۔ ہم پرانے افزوں انبار کو نئی مصروفیات میں ضم کر دیتے ہیں۔ ہم کبھی ختم نہ ہونے والے کام کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہمیشہ مصروف رہتے ہیں۔ بارہ گھنٹوں کے دن میں بھلا سونا کیا، جاگنا کیا۔ ہم بیٹھے بیٹھے مختصر دورانیوں کی اونگھ لے لیتے ہیں۔ ہمیشہ گروہوں کی صورت میں مسلح رہتے ہیں۔ چاہے گھر کے اندر ہوں یا باہر، اکیلے نہیں رہتے۔ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ اپنے عمل تولید کو سریع کر دیں۔ اس گھڑی کا انتظار کریں جب ہم تعداد میں ان چوہوں سے کئی گنا ہو جائیں اور ان پر غالب آ جائیں گے۔ جن لوگوں نے انہیں دیکھا ہے وہ بتاتے ہیں کہ یہ خوب فربہ اور جسیم ہیں۔ ظاہر ہے یہ ہمارے ہی بھائی بندوں کا گوشت ہے جس نے انہیں یہ طاقت اور جسامت عطا کی ہے۔ سو یہ کیونکر بدذائقہ ہوگا۔

پس نوشت: میرا نام احسان الٰہی تو ندل ہے۔ ایک عاجز خادم ہوں۔ تمام دن کائی زدہ بیس منٹ کے ڈربے میں کھاتہ جات کے درمیان دبکا پڑا رہتا ہوں۔ جب سے اوپر فلیٹ میں مرگ ہوئی ہے میری حالت غیر ہے۔ بار بار ذہن میں یہی خیال آتا ہے کہ اس جواں سال آدمی کی موت کا میں ہی ذمہ دار ہوں۔ یہ چوہے، جنھوں نے اس کی جان لی، صد افسوس کہ میرے ہی پالے ہوئے ہیں۔ فلیٹوں سے شکار کر کے میں انہیں مارے بغیر اس خیال سے مین ہول میں ڈالتا رہا کہ خود ہی پانی انہیں بہا کر دور لے جائے گا۔ کبھی یہ گمان بھی نہیں گزرا کہ ایک روز یہ اکٹھے ہو کر ایسا بھیانک انتقام لیں گے۔ کیسی جوان موت تھی۔ خدا مجھے معاف کرے۔ اپنی غلطی کے ازالے کی مجھے تو کوئی صورت نظر نہیں آتی سوائے اس کے کہ ان جانوروں سے انتقام لینے کا عہد کروں۔ میں عہد کرتا ہوں کہ جب تک زندہ ہوں ہر اس چوہے کو، جو کبھی میری گرفت میں آیا، ہرگز زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

(14 ستمبر 2001)

مرتب کا نوٹ:

کچھ زیادہ تو نہیں لیکن تاریخ میں معمولی شد بد ضرور رکھتا ہوں۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے چوہوں کے اس غول کا کسی تاریخی دستاویز میں تذکرہ موجود نہیں ہے۔ ایک وبا کا حوالہ البتہ بار بار ملتا ہے کہ سورج کی روپوشی کے فوراً بعد بے خوابی کے عارضے نے یہاں ایک عرصہ خلقت عالم کو زیست و موت کے دوراہے پر کھڑا رکھا۔ لوگوں کی بڑی تعداد مسلسل جاگتے رہنے سے مختل الحواسی کا شکار ہوئی۔ ایک قیاس تو یہ ہے کہ یہ کہانی ایسے ہی ایک مختل الذہن مریض کے مدرکات پر مبنی کھلی آنکھوں سے دیکھا گیا ایک ڈراؤنا خواب ہے۔ یا پھر ایسا ممکن ہے کہ ایک مختل الحواس نسل ایسی گزری ہو جس کا دستیاب شدہ تاریخ میں تذکرہ موجود نہ ہو۔ اسی نسل کے ایک قائم الحواس فرد نے اس روداد کو لکھا ہو۔

(رات تین بجے، 19 دسمبر 2180ء)

خواب کہانی

میں نے خواب میں ایک کہانی لکھی۔

کہانی کا عنوان اور ابتدائیہ مجھے یاد نہیں رہا۔ جو چیز یاد آتی ہے وہ ایک واقعہ ہے جو ہردلعزیز فلمی اداکار وحشی جٹ کے روایتی دشمن نوری نتھ کے گم ہو جانے، اغوا ہو جانے یا مر جانے وغیرہ سے متعلق تھا۔

ایک تصریح البتہ یہاں ضروری ہے۔ جن لوگوں نے نوری نتھ کو فلموں وغیرہ میں دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ ایک چھ فٹا، بھاری ڈیل ڈول، کرخت چہرے اور پھولی ہوئی گھی موچھوں والا پاجی اور درندہ صفت بدمعاش ہے۔ قتل کر دینا، عورتیں اغوا کرنا، شریفوں کو دق کرنا' وغیرہ اس کے محبوب مشغلے ہیں۔ اس کا جوڑ وحشی جٹ ہی ہے جس کے آگے اسکی ایک نہیں چلتی۔ فلم میں انٹرول کے فوراً بعد اور کبھی اس سے پہلے ہی، جب اس کا جبر واستبداد اپنی انتہا کو جا پہنچتا ہے، تو اس کا سامنا وحشی جٹ سے ہوتا ہے۔ اس سنسنی خیز منظر کا تماشائی فلم کے آغاز ہی سے انتظار کرتے ہیں۔ وحشی جٹ اسے للکارتا اور حملے کا موقع دیے بغیر گنڈاسے کا ایک ہی وار اس کی ٹانگ پر کرتا ہے۔ کھٹاک سے ٹانگ کٹ کر پرے جا گرتی ہے۔ درد کی شدت سے نوری نتھ کراہتا ہے۔ یہ ایسا ہولناک منظر ہوتا ہے کہ تماشائی منہ کھولے، سانس روکے سکرین کو ایک ٹک تکتے رہ جاتے ہیں۔ موت کی سی خاموشی سارے میں پر پھڑپھڑاتی ہر طرف منڈلاتی ہے۔ تب اچانک ان میں سے کوئی من چلا نعرہ مستانہ بلند کرتا ہے۔ پھر تو جیسے سبھی جاگ اٹھتے ہیں۔ ایسی چیخم دھاڑ اور ہاؤ ہو مچتی ہے کہ الامان الحفیظ۔

لیکن یہ نوری نتھ کا وہ سراپا ہے جو ہم اور آپ بیدار لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے۔ روزمرہ کی عمومی منطق اور خواب کی منطق کا بھلا کیا میل۔ خواب میں جس شے کو نوری نتھ تصور کیا گیا' وہ انسان تو خیر کیا ہو گی' سرے سے کوئی زندہ وجود ہی نہیں تھی۔ وہ ایک مخروطی مینار کی صورت کا کوئی پانچ ساڑھے پانچ فٹ بلند، پیندے سے ڈھائی یا تین اور بالائی سرے سے کوئی ایک آدھ فٹ چوڑا اسفید پتھر تھا۔ ہشت پہلو صورت کے ساتھ وہ اہرام جیسی کوئی شے معلوم ہوتا۔ اس پر خاص طرح کے کیمیکل سے پالش ہوئی تھی جس سے یہ شیشے کی طرح چمکتا اور سورج کی روشنی کو منعکس کرتا۔ اس کے نچلے چوڑے حصے پر خاص دیہاتی زرد اور ہرے رنگ کی دھاریوں سے مختلف نقش و نگار کندہ اور جانوروں جیسے شیر، عقاب، سانپ وغیرہ کی شبیہیں نقش تھیں۔

مجھے یاد ہے کہ تب میں نے جبر واستبداد کے طریقوں سے متعلق کافی پلندہ لکھا تھا۔ وہ سب کچھ تو اب ذہن میں موجود نہیں ہے۔ یہ چند موٹی موٹی باتیں ہی یاد رہ گئی ہیں۔ وہ اپنی کانچ جیسی سطح سے سورج کی روشنی منعکس کر کے لوگوں کو اندھا کر ڈالتا تھا۔ اسی روشنی سے وہ ان کے کھیت کھلیان، گھر، سکول، مسجدیں اور ہسپتال جلا ڈالتا۔ کبھی راہ میں کھڑا ہو جاتا اور ان کی طرف آتی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کو روک لیتا۔ حبس ہو جاتا۔ لوگ سانس گھٹنے

سے تڑپتے۔ کبھی وہ راہ گیروں کا راستہ روکتا اور اپنے لشکارے سے ان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتا۔ وہ چندھیائے ہوئے سے آ کر اس سے ٹکراتے۔

کبھی یہ قصبوں اور دیہاتوں میں رات ہی نہیں ہونے دیتا تھا۔ چاند کی روشنی کو منعکس کر کے اتنا چانن کر دیتا کہ پرندے درختوں پر شور مچاتے اور دن بھر کے تھکے ماندے لوگ سو ہی نہ پاتے۔ وہ دہائی دیتے۔ عورتیں سینہ کوبی کرتیں۔ ایسے میں نجات دہندہ کی صورت میں وحشی جٹ تریزوں والا شوخ رنگ کا ریشمی کرتہ، رنگ دار لاچہ، پشاوری چپل پہنے، چار خانوں کا مظفر گلے میں لپیٹے، کانوں میں مندرے، چھاتی پر جھولتا اور کھلے گریبان سے باہر جھلکتا سیاہ تعویز ڈالے، آنکھوں میں سرمے کی دھاری اور کلائی میں پیتل کے کڑے کے ساتھ سکرین پر انٹری ڈالتا۔

ایسی ایک لڑائی کا منظر بھی میں نے تب لکھا تھا۔ اس نے گنڈاسہ فضا میں لہرا کر اسے للکارا اور تنبیہہ کی کہ وہ اپنے جور و ستم سے باز آئے ورنہ وہ اس پر خدا کا قہر بن کر نازل ہوگا۔ پھر وہ چیتے کی سی پھرتی سے اپنے تنومند جسم کو جھلاتا ہوا اس پر جھپٹا اور اپنے ماتھے کو پوری قوت سے اس پر دے مارا۔ خون کی دھار گھاؤ میں سے پھوٹ نکلی اور چہرے پر بہتی ہوئی اس کے سفید کرتے کو بھگو گئی۔ اس نے فتح مندی کے گہرے احساس کے ساتھ سر کو جھٹکا۔ خون کے چھینٹوں کی پھواری نوری نتھ پر پڑی اور اسے مات ہوگئی۔

میرا خواب اصل میں نوری نتھ کے گم ہو جانے کے واقعے سے شروع ہوا۔ ایک روز لوگ نوری نتھ کو اس احاطہ میں دیکھنے گئے جہاں وہ ہمیشہ سے مقیم تھا تو اسے غائب پایا۔ پولیس تحقیقات شروع ہوئیں۔ لوگوں نے خوب شور مچایا۔ شہر بھر میں ناکے لگا دیئے گئے۔ بستہ الف اور ب کے چھٹے ہوئے بدمعاشوں کو، جن کی نوری نتھ سے رقابت فرض کی جا سکتی تھی، تھانوں میں لائن حاضر کیا گیا۔ ان سے ہر طرح سے اگلوانے کی کوشش کی گئی لیکن بے سود۔ اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ وہ یوں غائب ہو گیا تھا جیسے کبھی تھا ہی نہیں اور جیسے اس سے متعلق ہماری یادیں محض ایک واہمہ تھیں۔

مجھے ایک اور منظر یاد ہے جو وحشی جٹ کی بے وقت موت سے کچھ ہی عرصہ پہلے رونما ہوا۔ وحشی جٹ اپنے مخصوص فلمی گٹ اپ میں گنڈاسہ فضا میں لہراتا، چیتے کی سی پھرتی سے اپنے تنومند جسم کو جھلاتا نوری نتھ کی طرف لپکا جو اصل میں نوری نتھ نہیں تھا بلکہ اس کا ہم شکل تھا اور دھوپ کی روشنی میں ہیرے کی طرح چمک رہا تھا۔ وحشی جٹ نے بڑھک ماری۔ فضا میں اس کی گونج سے وحشت کی چنگاری بھڑکی۔ زمین اس کے پیروں تلے تھرتھرائی۔ لیکن اس سے گنڈاسہ بھر کے فاصلے پر ہی اس کے بجلی کی سی تیزی سے بھاگتے قدم یکبارگی تھم گئے۔ وہ ایک پیر آگے بڑھائے بغیر بازوؤں کو فضا میں اٹھائے اور چہرے کو آگے کیے ہوئے ایک مجسمے کی طرح ساکت ہو گیا۔ گویا وہ کوئی تصویر تھا۔ جیسے وقت تھم گیا تھا۔ کوئی ایک لمحہ تھا جو وقت کے عظیم بہاؤ سے کٹ کر منجمد ہو گیا تھا۔

وحشی جٹ نے پژمردہ انداز میں گنڈاسہ زمین پر ڈال دیا جیسے کوئی شکست خوردہ سپاہی اپنے ہتھیار گرا دیتا ہے۔ وہ یوں نڈھال دکھائی دیا جیسے ان چند لمحوں میں اس نے زندگی کی سب سے بڑی جنگ لڑی ہو اور پہلی بار اسے شکست ہوئی ہو۔ وہ اپنے ارد گرد حیران چہروں پر نگاہ ڈالے بغیر تھکے تھکے قدموں سے ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔ کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہ کی۔ اس نے دروازے کی چٹخنی چڑھا لی اور آئینے کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ دیر تک ایک ٹک خود کو دیکھا کیا۔ پھر معاً اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

پھر کچھ ایسا سننے میں آیا کہ وحشی جٹ خلوت گزیں ہو گیا۔ اس نے خود کو فلمی، گھریلو اور ہر نوع کی مصروفیات سے قطع تعلق کر کے گھر کے

ایک کمرے میں محبوس کر لیا۔ اس کا آخری بیان جو بیرونی دنیا کو موصول ہوا' فلمی دنیا سے کنارہ کشی کا اعلان تھا۔ حتی کہ پھر ایک دن معلوم ہوا کہ وہ خاموشی سے مرگیا۔ فلم سازوں سے جس طور بن پڑا انہوں نے دونوں کے متبادل اداکاروں کے ساتھ فلم بنائی گئی۔ لیکن وہ پٹ گئی۔ بلکہ الٹا فلم بینوں نے اس بات کا اتنا برا مانا کہ سینما ہالوں کی کرسیوں کے ریگزین چیر ڈالے۔

وحشی جٹ کا عجائب گھر بھی کیا خاصے کی چیز تھا۔ کتنے ہی کنالوں پر پھیلی ہوئی' جس کے چاروں کونوں پر قدیم رومی طرز تعمیر سے مشابہہ سفید سنگ مرمر کے اونچے گول ستون تھے۔ اسکے بڑے کمروں میں شیشے کی الماریوں میں وحشی جٹ سے منسوب ہر شے موجود تھی۔ اس کے فلمی ملبوسات اور گٹ اپ کا سامان جیسے وگ، نقلی مونچھیں اور داڑھی' گھریلو لباس اور دیگر سامان' برتن، فرنیچر، جاء نماز، تسبیح، سفید سوتی ٹوپیاں اور چپل، اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کاغذات اور خطوط، اس کی تصویریں، تعریفی اسناد اور تمغے۔ لوگ جوق در جوق عجائب گھر کو دیکھنے آتے۔ جو رقیق القلب تھے، وہ صدر دروازے سے ذرا ہی آگے ایک قطار میں بنچوں پر بیٹھ جاتے۔ وہ یہاں باغ میں ننھے سرخ پھولوں والی بوگن ویلیا کی گھنی بیل کی چھاؤں میں سنگ مرمر کے اونچے استھان پر ایستادہ اس کے سنگین مجسمے، جس میں اسے گھوڑے پر سوار دکھایا گیا تھا، اور برابر ہی چند قدم پر بڑی محرابی دیوار پر آویزاں اس کے قد آدم تصویر کو دیکھ کر ٹھٹھک جاتے۔ دیر تک اسے ایک ٹک تکتے۔ پھر اپنا گریہ روک نہ پاتے اور ہولے ہولے آنسو بہاتے۔ حتی کہ ہچکی بندھ جاتی۔

اس کشادہ باغ سے آگے دو سیڑھیوں کا زینہ تھا۔ پھر اونچی چھتوں والی محراب دار ٹھنڈی راہداریاں تھیں جو ایک طرف نوادرات اور زیارات کے بڑے ہال کی طرف نکل جاتی اور دوسری جانب چھوٹے سے تالاب، جس میں سفید مرمریں گھوڑی کے منہ سے پانی کا فوارہ چھوٹتا ہے، والے صحن کے پرے سہ منزلہ چھت دار بازار سے جا ملتی تھیں۔ بازار میں طرح طرح کی دکانیں تھیں۔ چھوٹے چھوٹے سٹال اور بڑے بڑے شوروم تھے جہاں وحشی جٹ کی فلموں کے ویڈیو پرنٹس، اس کی یک رخی شبیہ والی اشیاء جیسے چابیوں کے چھلے، انگوٹھیاں، زیورات، ملبوسات، دوپٹے، انگیائیں، ہیئر کلپ، اونی و سوتی ٹوپیاں، جوتے، قلم، سگریٹ، عطر اور جانے کیا کیا کچھ بکتا۔

اس کے بعد کا خواب نہایت بے ربط مناظر پر مشتمل تھا۔ ان میں سے کچھ مناظر تو میں نے خواب کے شروع میں لکھے، کچھ آخر میں اور کچھ جو ترتیب کے اعتبار سے پہلے یا بعد میں لکھنے چاہئیں تھے وہ درمیان میں کہیں۔ غرضیکہ مکمل انتشار کے ساتھ۔ چند ایک مناظر ایسے بھی تھے جن کے متعلق مجھے ہنوز شک ہے کہ یہ میرے خواب کا حصہ نہیں تھے۔ میرے ذہن میں موجود ضرور تھے لیکن میں نے انہیں خواب میں نہیں لکھا بلکہ مجھے گمان ہے یہ بعد میں خواب کے نتیجے میں اور غالباً خواب کی بے ربطی کے مداوے کے طور پر میرے ذہن نے اختراع کیے۔

واقعہ یوں تھا کہ قومی زبان میں چھپنے والے کثیر الاشاعت جریدے میں (اس کا نام پاتال ڈپال یا اس سے ملتا جلتا کچھ تھا) وحشی جٹ کے حوالے سے ایک انتہائی فکر انگیز مضمون چھپا جس نے فوراً ہی خاص و عام کی توجہ کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ سرسری طور پر ہی سہی مگر مجھے یاد ہے خواب میں یہ مضمون میں نے دیکھا تھا۔ مجھے اس کا عنوان یاد رہا نہ اس کے مصنف کا نام ہی۔

مضمون کوئی تیس ایک صفحات پر مشتمل تھا۔ عام قاعدہ سائز کے رسالے کے بارہ کے قریب صفحے تو وحشی جٹ کے شخصی محاسن کے بیان سے

بھرے تھے۔ مزید دس ایک صفحات میں اس کی فنی زندگی کا احوال درج تھا۔ آخری صفحات میں، جو قریب سات یا آٹھ کے لگ بھگ تھے، مصنف نے یکسر مختلف پیرایہ اظہار بروئے کار لاتے ہوئے ایک نیا موضوع بحث چھیڑا اور در اصل یہی حصہ مضمون کی ملک گیر شہرت کا باعث بنا۔ متعدد دلائل کی مدد سے مصنف نے اس مفروضہ کو ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ملکی فلمی صنعت کے لیے وحشی جٹ بلاشبہ اس مقام و مرتبہ کا حامل ہے جو بانی ملک کو حاصل ہے۔ ان دلائل کی فہرست خاصی طویل تھی جو مجھے یاد نہیں رہی لیکن ایک اور بات یاد رہی کہ مصنف نے کہا کہ اگر یہ تجویز پیش کی جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ملکی کرنسی نوٹ پر ایک طرف بانی ملک کی تصویر موجود ہے تو دوسری طرف ایک بیضوی چوکھٹا خالی کیوں رکھا جائے۔ ضروری ہے کہ کیلنڈروں، عدالتوں، سرکاری و غیر سرکاری دفاتر، چوراہوں اور ہر اس جگہ جہاں بانی ملک کی تصویر تنہا ہے، اسے وحشی جٹ کی تصویر سے ملا کر ایک اکائی کی صورت دے دی جائے۔

مصنف کے معروضات پر عوام الناس کے ردعمل کا میرے ذہن میں مبہم سا تاثر موجود ہے۔ غالباً یہ خاصا پرزور اور شدید تھا۔ بسوں، ویگنوں، چائے خانوں، دفتروں، گھروں، ریلوے سٹیشنوں کی انتظار گاہوں، اسمبلی کے اجلاسوں، اخبارات و رسائل، تھانوں، ہسپتالوں، ریڈیو، ٹی وی۔ الغرض ہر اس جگہ جہاں دو آدمی اکٹھے ہوتے یا کوئی بات کرنی یا لکھی جانی ممکن ہوتی، اسی مضمون کا ذکر و فکر رہتا۔

میرا خیال ہے میں نے یہی لکھا تھا کہ کرنسی نوٹ پر وحشی جٹ کی تصویر والی تجویز کو حکومت نے عوام کے پرزور اصرار پر مان لیا۔ شاید ایسا ہی ہوا تھا کہ پرانے کرنسی نوٹ کالعدم قرار دیکر نئے چھاپے گئے تھے جن پر دونوں رہنماؤں کی تصویریں ساتھ ساتھ موجود تھیں یا پھر الگ سے ایسے نوٹ چھاپے گئے تھے جن پر صرف وحشی جٹ کی تصویر تھی۔

مجھے یاد ہے میں نے خواب میں اس کہانی کا ایک انجام بھی لکھا تھا۔ لیکن انجام لکھنے کے بعد یا شاید اس سے پہلے ایک اور واقعہ بھی میں نے لکھا جو مجھے یاد رہا۔ یہ نوری نتھ کے پھر سے مل جانے سے متعلق تھا۔

شاید نوری نتھ کی بازیابی کی خبر پہلے ایک افواہ کے طور پر اخبار میں چھپی تھی۔ جیسا عموماً ایسے معاملات میں ہوتا ہے۔ افوہ سازوں کی خوب چاندی تھی۔

مجھے اس تقریب کی دھندلی سی تفصیلات یاد ہیں جس میں صدر مملکت نے نوری نتھ کو فلمی صنعت کے نمائندگان کے حوالے کیا۔ لوگوں کا بے کنار متلاطم ازدحام تھا جو نوری نتھ کی ایک جھلک دیکھنے کو ملک کے گوشے گوشے سے نیشنل پارک میں اکٹھا ہوا۔ یقین و بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا بے چینی سے کروٹیں بدلتا ہوا جیسے ایک خفتہ آتش فشاں پہاڑ ہو جس کے بھیتر میں لاوا ابل رہا ہو۔ اگر نوری نتھ کے ملنے کی خبر جھوٹ نکلی تو جیسے ابھی یہ لاوا پھوٹ بہے گا اور پھر نہ معلوم کیا ہو۔

آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی میں ایک بہت کشادہ سٹیج پر چار حسینائیں اپنے نازک کاندھوں پر ایک طلائی کامدار پالکی اٹھائے نمودار ہوئیں۔ پالکی میں کمخواب کے مرصع پردوں کے بیچ ریشمی نرم گدے پر نوری نتھ براجمان تھا۔ ہمیشہ جیسی بے حسی اور سفاکی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس کے باوجود آج وہ سب کے لیے کس قدر عزیز ہو گیا تھا یہ تو کوئی انہی سے پوچھے۔ عین اس لمحے سٹیج کے برابر کھڑے فوجی دھنیں بجاتے بینڈ

باجے والے یکدم خاموش ہو گئے۔ رنگ برنگی جھنڈیاں لہراتے سکول کی بچیوں کے گھومتے دائرے تھم گئے۔ دیکھنے والوں کے سانس اس منظر کی تاب نہ لا کر مدھم ہوتے ہوئے رک گئے۔ فضا میں تقدس سے مملو گہرا سناٹا چھا گیا۔ زبانیں گنگ ہو گئیں اور آنکھیں فرطِ جذبات سے نم۔

لوگوں نے گداز دل اور پرنم آنکھوں کے ساتھ گزرے ہوئے اچھے دنوں کو یاد کیا جب ان کے خیال میں سب کچھ کتنا ٹھیک تھا۔ گولڈن جوبلی فلمیں، کھڑکی توڑ ہفتے، وہ ہاؤ ہو۔ یہ خواب جیسی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ ایک بہت سہانا خواب۔

سوچتا ہوں آخر اس کہانی کا کیا انجام ہو سکتا تھا۔ میں نے لکھا بھی مگر یاد نہیں آتا۔ ایک خیال یہ بھی آتا ہے کہ شاید میں نے انجام فقط سوچا تھا اور لکھا نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے میں نے خواب میں اپنا قلم کاغذوں کے پلندے پر ڈال دیا تھا۔ مجھے شدید خواہش ہوئی کہ اٹھوں اور سامنے سڑک کے پار جو وحشی جٹ میوزیم موجود ہے، وہاں جاؤں۔ وحشی جٹ کی یاد نے میرے دل کو مسوس دیا تھا۔ کیسا شینہ جوان تھا۔ بے وقت ہی موت نے اسے آلیا۔

غالباً یہ خواب کا اخیر ہی تھا۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کے پٹ کھول دیئے اور باہر دیکھا۔ تیز ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور مغرب کی سمت سے گہرے بھورے بادل امنڈے چلے آرہے تھے۔

جنوری 96 تا جولائی 98

چالیس سال پر محیط ایک لمحہ

وہ جانتا تھا دفتر میں معذرت کی ایک درخواست جمع کروانے اور مینیجر سے بالمشافہ مل کر اپنے گذشتہ غیر ذمہ دارانہ رویے کی وجوہات پیش کر دینے کے بعد وہ اپنی نوکری بچانے میں کامیاب ہو جائے گا اور پچھلے بہت دنوں سے التوا میں پڑا کام اگر وہ ذرا سخت محنت کرے تو آئندہ چند دنوں یا دو تین ہفتوں میں بھگتا لے گا۔ اور یہ کہ اگر محنت سے کام کرنا جاری رکھے تو ایک عرصے سے رکی ہوئی اس کی ترقی بھی جلد ہی ممکن تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ آئندہ مہینے اوور ٹائم لگا کر وہ اتنے اضافی پیسے اکٹھے کر سکتا تھا جس سے وہ اپنی بیوی کو گرمیوں کے لیے لان کا سوٹ اور بچے کو سائیکل خرید دے جس کے لیے وہ دونوں ایک عرصے سے اصرار کر رہے تھے۔ وہ ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے گھر کے سمت ہولیا۔

لیکن اس خاص دن کے آغاز پر ہر شے اتنی آسان نہیں تھی۔ اس دن کو اپنی مرضی سے بتانے کا تہیہ کرنے کے بعد وہ دفتر نہیں گیا تھا۔ سارا دن لارنس گارڈن میں بیٹھا رہا۔ صبح پہاڑی پر موجود بنچ پر جا بیٹھا۔ دوپہر ہوئی تو نیچے کرکٹ گراؤنڈ کے برابر والے پلاٹ میں گھاس پر لیٹ گیا۔ پھر لائبریری سے ملحق کنٹین پر آیا۔ ایک برگر کھایا۔ پیپسی پی۔ دو سگریٹ ریڈ اینڈ وہائٹ کے لیے۔ ایک سلگا کر کش لگایا۔ دوسرا قمیض کی جیب میں ڈال لیا۔ پانچ بجے کے قریب فوارے والے پلاٹ میں آ کر پیپل کے پھیلے ہوئے درخت کے نیچے بنچ پر بیٹھ گیا۔

اب سائے گہرے اور روشنی کم ہو رہی تھی۔ اسے پھر سے بھوک محسوس ہوئی۔ وہ گھر جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا جب اس نے ایک بچے کو دیکھا جو جانے کب سے بنچ پر اس کے برابر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ بچے کو اپنی جانب دیکھتے ہوئے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس نے چہرے کو موڑا اور دور درختوں کی پھیلی ہوئی شاخوں سے پرے آسمان پر پھیکے سے چاند کو تکنے لگا جو ابھی رات نہیں ہوئی تھی کہ ذرا عجلت میں نمودار ہو گیا تھا۔ جوں جوں رات گہری ہو گی یہ بھی گاڑھا ہوگا اور اپنے جوبن پر آ جائے گا۔ اس نے سوچا اور گردن پھیر کر بائیں جانب دیکھا۔ لڑکا بدستور اسے دیکھ رہا تھا۔

سر کے اشارے سے اس نے لڑکے سے کچھ خاموش سا سوال کیا کہ وہ کون ہے، کیا چاہتا ہے، اسے کیوں اتنے غور سے تک رہا ہے اور کب سے یہاں ہے۔ سوال اتنے زیادہ تھے کہ لڑکے نے محض بے نیازی کی ادا سے مسکرا کر جواب دینے پر اکتفا کیا اور اسے دیکھنا جاری رکھا۔

''تم کہاں رہتے ہو؟'' آخر اس نے پوچھا۔ لڑکے نے ہاتھ پھیلا کر پرے درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ یہی کوئی تیرہ چودہ برس کا تھا۔ کھلتی ہوئی گندمی رنگت، کتابی چہرہ جیسا خود اس کا تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، خود اس کی آنکھوں کی طرح۔ منہ کا تنگ دہانہ اور بال پیچھے کو گرائے ہوئے۔ معلوم نہیں کیوں اسے لگا اتنی عمر میں وہ خود بھی ایسا ہی ہوگا۔

کچھ دیر وہ درختوں کے جھنڈ سے پرے دیکھتا رہا جہاں دور تک پھیلا ہوا باغ تھا اور اس سے آگے سڑک۔ اس کی پرلی جانب دفاتر تھے اور ان کے عقب میں اقامتی علاقہ جو دو دو تین تین کنال کی پرشکوہ کوٹھیوں پر مشتمل تھا۔ لڑکا اپنے حلیے سے اسے کسی متوسط گھرانے کا لگا جو ظاہر ہے اس دولت مند علاقے میں رہنے سے رہا۔

''پڑھتے ہو؟'' اس نے لڑکے میں دلچسپی محسوس کی۔

''نہیں۔'' لڑکے نے پہلی بار زبان کھولی۔

پھر دونوں خاموش ہو کر اپنے سامنے تکنے لگے۔ لڑکے کو سامنے جنگلے کے وسط میں اوپر تک اٹھتے ہوئے فوارے نے اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا سو اس نے اسے تکنا موقوف کر دیا۔

ایک چنے بیچنے والا ان کے قریب سے گزرا ''مرغ چنے۔ بارہ مسالے۔''

''چنے'' اس نے اسے بلایا۔ ''ایک دے دو۔'' چار روپے دے کر اس نے کپی کی شکل میں موڑ کر تکونے بنے ہوئے کاغذ میں بھرے ہوئے چنے خریدے۔ پھر کپی کو کھولا۔ کچھ چنے اپنی ہتھیلی پر گرائے اور پھر اسے لڑکے کی طرف بڑھایا۔ ''کھاؤ گے۔'' لڑکے نے کپی لے لی اور منہ کے پاس لا کر یوں ٹیڑھی کی کہ بہت سے چنے اس کے منہ کے اندر لڑھک گئے۔ کپی آدھی سے زیادہ خالی ہو گئی تو لڑکے نے اسے واپس لوٹا دی۔

''کوئی کام دھندا کرتے ہو۔'' اس نے پوچھا۔ شکل سے تو وہ طالبعلم لگتا تھا۔

''نہیں'' لڑکے نے چنوں سے بھرے منہ میں سے گھٹی گھٹی آواز نکالی۔

''کیا کرتے ہو؟'' اس کا تجسس بڑھ گیا ''بس یونہی۔

''کھیلتا ہوں۔'' لڑنے نے پھر سے اس کی طرف دیکھے بغیر کمال بے نیازی سے کہا اور کسی بات پر ہنس دیا۔ سامنے فوارے والے جنگلے کے پاس گیس والا غبارا چھوٹے بچے کے ہاتھ سے چھوٹ کر فضا میں بلند ہو گیا تھا۔ بچہ زار و قطار رو رہا تھا اور گھاس پر بیٹھا پیر مار مار کر احتجاج کر رہا تھا۔ اس کی نگاہ اوپر بلند تر ہوتے ہوئے غبارے سے چمٹی ہوئی تھی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اپنا بچپن یاد آ رہا تھا۔ اس نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ چالیس سال کے بعد انسان میں دانش کا ورود ہوتا ہے۔ وہ دانا بن جاتا ہے۔ اس نے سوچا کیا دانش اور بچپن کا آپس میں کوئی تعلق ہے؟ دانش کی عمر میں بچپن یاد آنے کے کیا معنی؟ وہ چل دیا۔ پھنکی مار کر چنے اس نے منہ میں ڈالے۔ بچے کھچے چنے ہتھیلی پر ڈالے اور خالی کاغذ کو پرے پھینک دیا۔ تب ایک عجیب بات ہوئی جس سے اسے پھر سے بچپن اور دانش کے باہمی تعلق پر سوچنے کی ترغیب ملی۔ لڑکے نے تیزی سے اٹھتے ہوئے گھاس پر سے کاغذ کی کپی اٹھائی اور پاس ہی پیپل کے درخت کے برابر پڑے ہوئے کوڑا کرکٹ کے رنگین پیپے میں پھینک دی۔

''باغ کی صفائی کا خیال رکھنا چاہئے۔'' لڑکے نے کچھ متانت سے کہا جیسے کسی دوسرے بچے کو کوئی اہم معلومات دے رہا ہو۔ لیکن اس نے لڑکے کی بات کو فہمائش کے طور پر لیا۔ ایک بچہ اسے مہذب دنیا کے اصول بتا رہا تھا۔ مہذب دنیا جس میں رہتے ہوئے اسے چالیس برس مکمل ہونے کو آئے تھے۔

وہ سامنے قائداعظم لائبریری کی طرف چل دیا جس کے پہلو میں نو تعمیر شدہ چھوٹا سا پارک اس کے سامنے تھا۔ لڑکا فوارے والے جنگلے کے گرد جہاں جہاں فوارے کی پھوار گر رہی تھی، بھاگتے ہوئے چکر کاٹ رہا تھا۔ وہ چلتے چلتے رک گیا اور لڑکے کو دیکھنے لگا۔ پھوار نے جیسے بچے کو مست کر دیا تھا۔ پھر وہ ایک جگہ جہاں مختلف رنگوں کے پھولوں کی کیاری بنی تھی ٹھٹھک گیا۔ پھولوں پر تتلیاں رقصاں تھیں جنہیں دیکھ کر لڑکے کے چہرے پر بھی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ پھر جیسے لڑکا ان تتلیوں کو مٹھی میں لینے کے لئے یوں لپکا کہ خود بھی محو رقص معلوم ہوا۔ بس تبھی اسے تمام فطرت رقصاں دکھائی دی۔ فطرت کا یہ رنگ اس سے پہلے کبھی اس پر عیاں

نہیں ہوا تھا۔ تو کیا یہ دانش ہے، اس نے سوچا۔ تو کیا یہ دانش ہے کہ فطرت اور زندگی کو ویسے دیکھا جائے جیسے ایک نوعمر لڑکا دیکھتا ہے؟

ہوا رکی ہوئی تھی جیسے سانس روکے ہوئے کسی انکشاف کی منتظر ہو۔ اس کے سانس کا زیر و بم بھی سست ہو گیا۔ معلوم نہیں کیا ہو جاتا۔ یہ زیر و بم تھم ہی جاتا کہ لڑکا اس کے برابر آن کھڑا ہوا۔

''کھیلو گے۔''

''کیا؟'' اس نے جیسے کسی خواب سے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''درختوں کا کھیل۔''

''درختوں کا کھیل''۔

''میں درختوں کے پیچھے چھپوں گا۔ تم مجھے ڈھونڈنا۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ درختوں کو دیکھنے لگا۔ لڑکا بھاگتا ہوا ایک چوڑے تنے والے درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ اس نے وہاں جا کر دیکھا۔ لڑکا موجود نہیں تھا۔ بس یہی درختوں کا کھیل تھا۔ وہ ایک کے بعد دوسرے درخت کی طرف بھاگنے لگا۔ کبھی اسے لڑکے کی جھلک دکھائی دیتی۔ کسی درخت کے پیچھے لڑکے کی کبھی نظر آتی۔ کہیں اس کا پیر، کہیں اس کا ہاتھ۔ لیکن وہاں پہنچنے پر اسے لڑکا کہیں دکھائی نہ دیتا۔ آخر وہ اسے بابا ترت کے مزار کے برابر جامن کے بلند درخت کے پیچھے ملا۔

''اب تم چھپو'' لڑکا بولا۔ لیکن وہ تھک چکا تھا۔

یوں وہ روزانہ ملنے لگے۔ شام کو دفتر سے چھٹی کر کے وہ لارنس چلا آتا۔ بیٹھتا وہیں اپنی مخصوص جگہ پر قائداعظم لائبریری کے سامنے فوارے والے پارک میں' پھیلی ہوئی شاخوں والے عمر رسیدہ درخت کے نیچے لکڑی کے بنچ پر۔ وہ لڑکا پہلے سے وہاں بیٹھا ہوتا' یا اس کے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد پہنچ جاتا۔ پھر وہ کبھی درختوں والا کھیل کھیلتے۔ کبھی وہ لڑکے کو اپنے بچپن کے قصے سناتا اور کبھی لڑکا اسے مختلف درختوں کے نام، ان پر آنے والے پھلوں اور پھولوں کے بارے میں بتاتا۔ درختوں کے بارے میں لڑکے کی غیر معمولی معلومات اسے حیران کرتیں۔ ہر بار جب وہ جدا ہونے سے پیشتر گالف روڈ والے گیٹ پر آتے، تو وہ لڑکے کو دیکھتا جو اسے گزرے ہوئے دن کے مقابلے میں کچھ زیادہ سیانا، اور کچھ زیادہ عمر کا لگتا۔

پھر ایک روز صبح شیو کرتے ہوئے اس نے اپنی مونچھوں اور کنپٹی کے بالوں میں برف جیسے سفید بال دیکھے۔ اس سے اگلے دن اور پھر اس سے بھی اگلے دن، اسے ان بالوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ محسوس ہوا۔ اس نے اپنی بیوی کو بتایا تو اس ہمیشہ کی بے زار عورت نے جھلا کر اسے دفتر سے سیدھا گھر آنے کو کہا اور تاکید کی کہ دفتر سے کچھ ادھار یا ایڈوانس لے لے، چھوٹے بچے عمران کو سکول میں داخل کرنے کی فیس جمع کرنی ہے۔ پھر وہ اسے بتانے لگی کہ گرمیاں شروع ہو رہی ہیں' اس کے پاس پہننے کو کوئی ڈھنگ کا سوٹ نہیں ہے۔ کبھی وہ اسے گھی، دالوں اور مصالحوں کے ختم ہونے کی خبر سناتی۔ کبھی شکایت کرتی کہ ہمارا بجلی کا بل پچھلے کتنے ہی مہینوں سے محلے کے دوسرے گھروں کی نسبت زیادہ آ رہا تھا اور وہ اس بارے میں کچھ کرتا کیوں نہیں ہے۔

اس باعث کہ بیوی اسے اپنی بات کہنے کی مہلت ہی نہیں دیتی تھی، اس نے ایک مدت سے بیوی کو دل کی بات بتانا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے برعکس وہ لڑکا پہروں اس سے اس کے بارے میں سنتا۔ وہ اتنا محو ہو کر اپنا دل اس کے سامنے کھولتا، کہ کبھی اسے خیال ہی نہ آتا کہ وہ لڑکے سے بھی اس کی بابت پوچھے۔ وہ کون تھا' کہاں رہتا تھا' کیا کرتا تھا؟

لڑکا پارک سے نکلنے کے لئے لوہے کا جنگلا پھلانگ جاتا۔ وہ بھی جنگلے کی نوک دار سلاخوں کو مٹھیوں میں لے کر ٹانگ پھیلا کر اوپر چڑھ جاتا اور اس پر سے کود جاتا۔ لڑکا آئس کریم کا کپ ہاتھ میں لے کر سڑک کے کنارے فٹ پاتھ کے سرے پر بیٹھ جاتا۔ وہ بھی اس کے برابر پھسکڑا مار لیتا۔ لڑکا سڑک پار کرتے ہوئے بھاگتا۔ وہ بھی بھاگتا۔ لڑکا اونچی آواز میں ہندوستانی فلموں کے گانے گاتا۔ وہ بھی اپنی بھدی آواز میں اونچی تانیں اڑاتا۔ لڑکا ہاں کہتا تو وہ بھی ہاں کہتا۔ لڑکا ناں کہتا تو وہ بھی ناں کہتا۔ لڑکا اس کا ہم راز ہی نہیں تھا۔ سایہ تھا۔ ایک پرتو تھا۔ ایسے فرد کا جو وہ نہیں تھا، لیکن جیسا بننے کی خواہش اور یہ بات اسے بس اب ہی معلوم ہوئی تھی' اس میں ہمیشہ سے موجود تھی۔

اور پھر یوں ہونے لگا کہ وہ دفتر سے جلدی چھٹی کر لیتا' سینما میں فلم دیکھنے کے لئے کہ لڑکا فلموں کا دلدادہ تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہر کامیڈی سین پر خوب کھلکھلا کر ہنستا۔ تالیاں پیٹتا۔ منہ میں دو انگلیاں رکھ کر سیٹی مارتا۔ ہر چند دن بعد دفتر والے اسے نوٹس جاری کرتے کہ کام میں بے توجہی کا مظاہرہ کرنے، بغیر اطلاع غیر حاضر ہونے اور دفتر سے اکثر جلدی چھٹی کر جانے پر سزا کے مستوجب ٹھہرائے جاؤ گے۔ لیکن وہ ہر نوٹس پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا۔

وہ ہر صبح اپنے سر، داڑھی اور مونچھوں کے بالوں میں سفید تاروں کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد کو حیرت سے تکتا۔ اپنی طرف بہت تیزی سے بڑھتے بڑھاپے کا سوچ کر اسے اپنی گزری ہوئی زندگی، اور خاص طور پر بچپن شدت سے یاد آتا اور پھر یہ خیال اس کی آنکھیں پرنم کر دیتا کہ اس کی عمر کا پیمانہ بس اب لبریز ہونے ہی والا ہے۔ آگے مختصر مستقبل تھا اور پیچھے طویل ماضی، جو بہت سی میٹھی یادوں کے دیوں سے جھلملا رہا تھا۔

ایک دن لڑکا صبح سویرے اس کے گھر پہنچ گیا۔ اس کی بیوی باورچی خانے میں اپنے بچے اور خاوند کے لئے ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ باہر کا دروازہ کھلا تھا۔ لڑکا سیدھا باتھ روم میں چلا آیا جہاں وہ شیو بنا رہا تھا۔ آئینے میں اسے اپنے پیچھے کھڑا دیکھ کر وہ اسے کچھ دیر کے لئے بالکل ہی نہ پہچان سکا۔ اب تو وہ اس کے قد سے اونچا معلوم ہوتا تھا۔ گالوں پر بالوں کی اولین فصل نمایاں تھی۔

''تم۔ یہاں کیسے۔'' وہ مڑتے ہوئے بس اتنا ہی کہہ پایا۔ پھر وہ دونوں باہر نکل آئے۔ اس روز وہ دفتر نہیں گیا۔ لڑکا اسے میوزیم دکھانے لے گیا جہاں پانچ ہزار سال پہلے کی تہذیب کی باقیات مٹی کے برتنوں، اور بتوں کی صورت میں موجود تھی۔

'شاید یہ ہمارے آباؤ اجداد نے بنائے تھے۔'' لڑکے نے کچھ نوادرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے بتایا۔ دوپہر کو انہوں نے بھاٹی چوک سے چھورے کھائے اور پھر شام کو داتا دربار قوالیاں سننے چلے گئے۔ جمعرات کی محفل تھی جس میں دور دور سے قوال ٹولیاں آئی ہوئی تھیں۔ محفل گرم تھی۔ ایسا سماں بندھا ہوا تھا کہ اسے لگا جیسے 'حال' آ رہا ہو۔ اس کا سر مستی میں گھومنے لگا اور اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر دھمال ڈالے یا اپنا سر کسی دیوار سے دے مارے یا اسے اتنی زور زور جھٹکے دے کہ اس کا بھیجا اچک کر باہر جا گرے۔ یہی موقع تھا جب وہ اٹھ کھڑا ہوا تو لڑکے نے اسے کلاوے میں لیا اور اس کے نحیف اور بوڑھے جسم کو بازوؤں میں اٹھائے دربار سے باہر لے آیا۔

سنگ مرمر کے کشادہ زینے پر بیٹھے ہوئے، جہاں زائرین جوق در جوق آ جا رہے تھے، اور ایک طرف اوپر والی سیڑھیوں پر بائیں جانب جوتیاں سنبھالنے والے بیٹھے تھے، وہ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔ اس نے اپنی نیم وا آنکھوں سے بازار میں لوگوں کے ہجوم کو دیکھا۔ ہر طرف دکانوں میں قمقموں کی چمک تھی۔ انسانی سروں کا ریلا تھا جو ہر طرف بہے جا رہا تھا۔ اس بھیڑ میں اس نے اچانک خود کو بہت اکیلا محسوس کیا۔ اس نے اپنے دفتر کے بارے میں سوچا جہاں ضرور آج کی بلا اطلاع غیر حاضری پر اسے فارغ کر دینے کا نوٹس تیار ہو چکا ہو گا۔ وہ ان کی آخری وارننگ بھی نظر انداز کر چکا تھا۔ اسے بڑی خفت کا احساس ہوا کہ وہ اپنے

گھر والوں کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ الٹے لگی بندھی نوکری بھی جاتی رہی۔

لڑکا گویا اس کے دل کے ورق پڑھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں خیالات کی آندھیوں کی دھمک محسوس کر رہا تھا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسہ دینے والی نظروں سے تکتے ہوئے بولا "میں ہوں نا، سب سنبھال لوں گا۔ تم فکر مت کرو۔"

اس کا دل یوں تیزی سے دھڑکا کہ لگا گلے میں آن پھنسا ہو۔ اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ اس نے رقت کے زور تلے لڑکے کو گلے سے لگا کر بھینچ لیا۔

بس یہی وہ لمحہ تھا، جب اندر مزار کے احاطے سے 'سارے میں کسی احساس کی طرح پھیلتا ہوا ایک نعرہ مستانہ 'حق ہو۔ حق ہو' بلند ہوا اور وہ تحلیل ہو کر لڑکے کے وجود کا حصہ بن گیا۔ کچھ دیر بعد سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر صرف وہ لڑکا تھا، جو لڑکا نہ رہا تھا' چالیس برس کا پختہ عمر آدمی بن چکا تھا۔

انتظار

بھاٹی گیٹ سے ذرا اندر آئیں، یہی کوئی دس بارہ قدم تو بائیں جانب ایک ڈھائی تین فٹ اونچی ڈیوڑھی پر چھوٹا سا مزار بنا ہوا دکھائی دے گا۔ یہ چھتر سائیں کا مزار ہے۔ اس کے برابر ایک کمرے کا میوزیم ہے جس میں شیشے کے پٹوں والی الماریوں میں چھتر سائیں کے عام استعمال کی اشیاء رکھی گئی ہیں۔ ایک تو ان کی چھتری ہے، جس کی وجہ سے انہیں چھتر سائیں کا نام ملا۔ مزار کے عقب میں ایک مسجد ہے جس کا دروازہ مزار کے برابر کھلتا ہے۔ مزار، مسجد اور میوزیم دو دو تین تین منزلہ مکانوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ بازار سے ذرا ہٹ کر ہوتے تو بہت ممکن تھا اب تک کسی کٹڑی کے صحن کا حصہ بن چکے ہوتے۔ خیر میں اس مزار اور خود چھتر سائیں کو تب سے جانتا ہوں جب وہ کرامات والے چھتر سائیں نہیں بنے تھے بلکہ تب ان کا کوئی نام نہیں تھا۔

مسلم ماڈل سکول، جہاں میں نے چھٹی جماعت میں داخلہ لیا، اس سے متعلق میری اولین یادوں میں چھتر سائیں سے وابستہ بہت سی یادیں موجود ہیں۔ چھٹی جماعت مجھے اس لئے بھی اچھی طرح یاد ہے کہ اسی زمانے میں میں نے سکول سے 'پھٹنے' کے سلسلے کا آغاز کیا۔ دو ایک دوست کلاس میں ایسے مل گئے جن کے ساتھ میں ہفتے میں دو تین بار سکول سے ہوا ہو جاتا۔ تب یہیں بھاٹی گیٹ کے باغ میں نالے کے ساتھ ساتھ گھوما پھرا کرتے۔ گندے نالے کے کنارے ایک جگہ چوڑا گڑھا تھا جہاں مجھے یاد ہے ایک مجذوب بیٹھتا تھا جو ہر وقت بے تکان مغلظات بکتا۔ بچے اسے حیرت سے تکتے اور ڈرتے بھی مگر تجسس کے مارے دور بھی نہ ہٹتے۔ وہ مغلظات بکتا تو بچے پتھر اٹھا کر اسے مارتے۔ وہ بھی غصے میں جو کچھ ہاتھ آتا ان کی طرف پھینکتا۔ بچے چیختے ''ننگا پڑ ننگا۔ لوہے دا ننگا۔'' وہ چڑتا اور منہ کو طرح طرح سے بناتا کچھ بکتا۔ لیکن اپنی جگہ سے ہلتا نہیں تھا۔ اس گڑھے میں جیسے وہ قید تھا یا کسی جادو نے اسے مٹی پر جما دیا تھا۔ وہ وہیں بول و براز کرتا۔ وہیں ایک کروٹ سو جاتا۔

میں عام طور پر صرف تبھی بھاٹی گیٹ کی طرف جاتا جب سکول سے رفو چکر ہوتا۔ وہیں باغ میں بچ پر اینٹ کے ٹکڑے سے بارہ ٹینی کھینچ کر اور اس پر پتوں اور پھولوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھ کر ہم دوست کھیلا کرتے۔ ساتویں جماعت میں میرے یاروں کی ٹولی تتر بتر ہو گئی۔ عالی موٹا سکول چھوڑ گیا۔ اقبال گنجا چھٹی ہی پاس نہ کر سکا۔ اکرم لوٹا اور سعید میرے ساتھ رہے۔ لیکن ہم تینوں ہی 'لائی لگ' قسم کے لڑکے تھے۔ ہمیں ایسے جی دار لڑکوں کی ضرورت رہتی جن کی ہم پیروی کریں۔ خود سے کوئی قدم اٹھانے کی مجھ میں ہمت تھی نہ ان میں۔ یوں ہمارا اسکول سے 'پھٹنا' بھی کم ہو گیا اور بھاٹی گیٹ جانا بھی۔

سو ہمیں پتہ ہی نہ چلا کہ کب چھتر سائیں کے دن پھر گئے۔ کب انہیں فیکا پہلوان جیسا مجاور مل گیا جو ان کی گندگی دھوتا، ان سے مغلظات سنتا، ان کی مار بھی کھاتا اور ان کی روٹی پانی کا خیال کرتا۔ وہیں چھتر سائیں کے گڑھے کے قریب ہی اس نے ٹین کی چادر کی آڑ سی بنا کر اپنے رہنے

اور سونے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو چہرے بشرے سے وہ کوئی چھٹا ہوا بدمعاش معلوم ہوا۔ اس کی بھیگی ہوئی شربتی سی آنکھوں کو نظر انداز کر دیں تو اس کی ظاہری ہیئت سے یہ اندازہ لگانا تقریباً ناممکن تھا کہ اس جناتی جثے والے انسان میں ایسا بیویوں جیسا برداشت کا مادہ موجود تھا۔ سوال یہ تھا کہ آخر کس لئے؟ وہ کس واسطے چھتر سائیں کے ناز اٹھاتا تھا؟ یہ بات کسی کو معلوم نہیں تھی۔

لوگ اسے چھتر سائیں کا سایہ، اس کا جانشین، ہم راز اور ایسے ہی نام دیتے۔ ان موقعوں کے علاوہ جب چھتر سائیں کی گالیوں وغیرہ میں سے اعداد کی نشاندہی کرنے کے لئے لوگ اس سے رجوع کرتے اور وہ مستعد ہو کر چوکڑی مار کر بیٹھ جاتا کہ سائلوں کی بات سنے اور انہیں قسمت کے اعداد بتائے، وہ عام طور پر اپنی ٹین کی آڑ والی کٹیا میں کسی پرانے ٹرک کے ٹائر کو سر کے نیچے رکھے لیٹا رہتا اور جانے کیا سوچتا۔ اس کی موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں میں بڑی معصومیت اور جاذبیت تھی۔

میرے والد چھتر سائیں کے معتقد تھے۔ انہیں ان کی کئی کرامات بھی ازبر تھیں۔ اکثر ہمیں سائیں سے وابستہ معجزات سناتے۔ بات یہ تھی کہ اندرون لوہاری گیٹ میں سٹہ بازی کے دو اڈے تھے۔ ایک سوتر منڈی میں تھا، جھنڈے خان کی حویلی کے تہہ خانے میں۔ دوسرا سید مٹھا بازار میں الیاس ٹیناں والے کی بیٹھک میں۔ میرے والد صاحب دونوں ہی اڈوں پر جایا کرتے تھے۔ یہ باتیں ظاہر ہے تب ہمیں معلوم نہیں تھیں۔ آہستہ آہستہ ادھر ادھر سے علم میں آئیں۔ میرے والد صاحب ہی نہیں، شہر بھر سے سٹہ باز، لوٹا گھمانے والے اور حتیٰ کہ حصص اور پرائز بونڈوں کا کام کرنے والے بھی چھتر سائیں کے پاس آتے۔ ان سے مغلظات سنتے اور پھر ان کے ترجمان فیکا پہلوان کے حضور پہنچتے۔ وہ کہتا ''سائیں ہوراں نے تہہ واری آکھیا دفع ہو جا۔ دو واری آکھیا آ تیریاں لتاں بھناں۔ تہہ واری جان نوں آکھیا، دو واری آن نوں، رہ گیا اک نمبر۔''

یا پھر یہ عقدہ کچھ اس طرح کھلتا ''سائیں ہوراں نے آکھیا تیری ماں نوں چار کتے ۔۔۔۔۔۔ اک مظلوم تے چار ظالم۔ اک ظالم نوں مظلوم کھا گیا۔ باقی رہ گئے تہہ۔''

کسی کا نمبر لگ جاتا تو وہ خوش ہو کر نذرانہ لاتا۔ سائیں ہر شے اٹھا کر پھینکتے جاتے۔ فیکا صرف کھانے پینے کا سامان رکھ لیتا۔ باقی روپیہ کپڑا لتا سب لوٹا دیتا۔ ایسے ہی کسی سرخرو ہونے والے سائل نے رنگ برنگے کپڑوں سے بنا ایک بڑا چھترا لا کر سائیں کے گڑھے کے کنارے نصب کر دیا کہ دھوپ اور بارش میں بھی سائیں سائے میں رہیں۔ اسی رنگ برنگے چھتر کی وجہ سے ان کا نام چھتر سائیں پڑا اور پھر یہی نام ہر طرف مشہور ہوا۔

چھتر سائیں کی اعداد ظاہر کرنے کی شکتی کو، کہتے ہیں فیکے پہلوان نے ہی دریافت کیا۔ فیکا خود بھی ایک جواری رہا تھا۔ گوجرانوالہ کا رہنے والا تھا اور پہلوانی کا شوق بھی رکھتا تھا۔ جوئے میں اپنی جائیداد لٹا دی تو گھر والوں نے اسے نکال باہر کیا۔ یہ سائیں کے آستانے پر آرہا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ ''سائیں ہوراں نے میرے من وچ حق سچ دا دیوا بالیا اے۔ حق۔ حق۔'' فیکا جناتی جثے کے ساتھ سائیں کی غلاظت دھوتا اور ان کی مار کھاتا ہوا ایک ایسے منظر کا حصہ معلوم ہوتا جو حقیقی نہیں لگتا تھا، کسی خواب یا فلم کے سیٹ کا حصہ معلوم ہوتا۔

میں ساتویں جماعت میں تھا جب میری والدہ کا انتقال ہوا۔ چھوٹا بھائی تیسری یا چوتھی میں ہوگا۔ بہن تین ساڑھے تین سال کی تھی۔ میرے والد نے اسی سال دوسری شادی کر لی۔ ہماری دوسری ماں مسلم ٹاؤن میں رہتی تھی۔ وہ بڑی مال دار عورت تھی۔ اس کا بہت بڑا مکان تھا جہاں

ہم ابو کی شادی کے کوئی ایک ڈیڑھ ماہ بعد ہی منتقل ہوئے۔ ہماری کبھی اس سے نہیں بنی۔ ہمیں ہماری ماں کبھی نہیں بھولی، جو خون کی الٹیاں کرتے ہوئے مری تھی۔ ہم اس عورت کو، جس کے ساتھ میں اس کی آخری سانس تک رہا، کبھی اپنی ماں کے طور پر قبول نہیں کر سکے۔

ہمارا باپ تو پہلے بھی کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرتا تھا۔ ماں ہی ٹیوشنیں پڑھا کر اور ہاتھ سے کروشیا وغیرہ کا کام کر کے اتنا کماتی کہ گھر کا خرچ پورا ہوتا۔ بلکہ الٹا وہ اکثر اس کی جمع جوڑ زبردستی لے جاتا اور جوئے میں ہار آتا۔ ہمیں یاد ہے اپنی ساری کمائی جوئے کی نذر کر دینے کے باوجود وہ کبھی مایوس نہیں ہوتا تھا۔ ہمیشہ اسے یقین رہتا کہ اگلی بار ضرور بازی اس کے ہاتھ میں ہی رہے گی۔ اب امیر عورت کا ساتھ ہوا تو کمانے کے لیے کبھی کبھار کچھ ہاتھ پیر مارنے کا تکلف بھی جاتا رہا۔ بلکہ اس نے ایک اور عادت شراب نوشی کی بھی اپنالی۔ روزانہ دھت ہو کر گھر آتا۔ اونچا بولتا۔ دوسری ماں جو ذرا 'ہتھ چھٹ' واقع ہوئی تھی، اس پر پل پڑتی۔ پھر وہ گھر میں ہی بیٹھ کر پینے لگا۔ میں دسویں جماعت کا امتحان دے کر فارغ ہوا تھا، جب وہ چل بسا۔ وہ بیمار رہنے لگا تھا۔ دو ایک بار ہسپتال میں بھی داخل ہوا۔ پتہ نہیں گردوں کا مسئلہ تھا یا کیا تھا؟ آخری بار ہسپتال گیا تو پھر اس کی لاش ہی ایمبولینس کے ذریعے واپس آئی۔

دوسری ماں کا رویہ یوں تو کبھی ہمارے ساتھ بہتر نہیں رہا تھا' ابو کی وفات کے بعد تو وہ بالکل ہی ہم سے بے زار ہو گئی۔ جیسا ایک سوتیلی ماں کے بارے میں سنا کرتے تھے' بس ویسی ہی جابر اور بات بات پر تذلیل کرنے والی۔ ایک بوڑھی عورت' جو کبھی اس کے ہاں ملازم تھی' ماہ دو ماہ بعد اس سے ملنے آتی تھی۔ وہ آدھ ایک گھنٹہ وہاں بیٹھتی۔ گاؤں کی کوئی سوغات جیسے موسمی پھل' گھر کا بنا ہوا گھی' ساگ' مرونڈے' یا ایسی ہی کوئی شے جو عام طور پر اس کی صحت کے موافق نہ ہوتی لیکن وہ اصرار کے ساتھ اسے کھاتی۔ ماں نے ہی بتایا کہ اس ملازمہ کی بیٹی کی شادی پر سارا خرچ اس نے اٹھایا تھا جس کا وہ احسان مانتی اور اس کے باوجود کہ وہ چونڈہ میں اپنے بیٹے کے پاس چلی گئی تھی' لاہور اپنی بیٹی سے ملنے آتی تو اسے سلام کرنے ضرور آتی۔ اس ملازمہ کے سامنے ہم تینوں بہن بھائیوں سے بالعموم اور مجھ سے بالخصوص اس کا رویہ بہت ہتک آمیز ہوتا۔ وہ ہمیں ایسے دیکھتی جیسے ہم کوئی ادنی اور حقیر مخلوق تھے جو کیچڑ میں لتھڑے ہوئے اس کے صاف ستھرے گھر میں پڑے گندگی پھیلا رہے تھے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جس کے سامنے وہ ہماری تذلیل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی' اس کا ہم سے برتاؤ بہت مشفقانہ تھا جیسے وہ ہماری حالت زار کا احساس کرتی اور اپنے رویے سے ماں کی بدسلوکی کا مداوا کرنے کی کوشش کرتی۔

میرا اندرون شہر جانا' جہاں میری کچھ سال پہلے تک کی ساری زندگی گزری تھی' مسلم ٹاؤن منتقل ہونے کے بعد قریب قریب موقوف ہو چکا تھا۔ ایف۔ اے کے ابھی داخلے نہیں کھلے تھے اور میرے پاس دن بھر میں کرنے کو کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اس فارغ عرصے میں گاہے بگاہے وہاں جانا شروع کیا۔ گھومتا گھامتا، دوستوں سے ملتا ملاتا معلوم نہیں کیوں ہر پھر کر چھتر سائیں کے ڈیرے تک پہنچ جاتا۔ وہاں اب تو بڑی رونق ہو گئی تھی۔ چھتر سائیں کا گڑھا ویسا بدہیئت نہیں رہا تھا، جیسا پہلے کبھی ہوا کرتا تھا۔ سائیں کے اعداد سے سرخرو ہونے والے کسی سائل نے وہاں آس پاس مٹی ڈلوا کر کافی رقبے میں کچا پکا فرش بنا دیا جو سرکتا ہوا فٹ پاتھ کے سرے تک آ گیا تھا۔ یہ اتنا کشادہ تھا کہ وہاں ہم دس بارہ لڑکے آسانی سے کرکٹ کھیل سکتے تھے۔ اس رقبے کے اردگرد فیکے پہلوان نے جھاڑ جھنکار رکھ دیا اور کہیں کہیں لکڑی کے شہتیر سے گاڑ کر رنگ برنگے جھنڈے لگا دیئے۔

سائلوں کے لئے دوایک چٹائیاں، دریاں اور موڑھے جیسی بیٹھنے کی چیزیں بھی کوئی سائل ہی وہاں رکھ گیا ہوگا یا پھر فیکا پہلوان خود ہی کسی کچرے کے ڈھیر سے اٹھالایا ہوگا۔ اب وہاں آنے والے سائلوں کو سائیں کے بدبودار گڑھے کے کنارے کھڑے ہو کر ان کی مغلظات سننے کا انتظار نہ کھینچنا پڑتا۔ وہ چٹائی یا موڑھا سرکا کر گڑھے کے پاس بیٹھ جاتے اور چھتر سائیں سے اپنے حق میں دعا کرنے کی درخواست کرتے جس کے جواب میں، جیسا کہ انہیں توقع اور خواہش بھی ہوتی، سائیں انہیں فحش گالیوں سے نوازتے جن میں جنون کا رنگ نمایاں ہوتا اور جو باقاعدہ گالیاں بھی نہیں ہوتی تھیں۔ اکثر مختلف جنسی اعضاء اور حرکات کو تکرار سے بیان کیا جاتا۔ یا کبھی وہ ایسی زبان میں اونچا بولتے جو کسی کو خاک بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ لیکن سائلوں کو یقین تھا کہ ان اجنبی آوازوں میں بھی کوئی پیغام تھا جسے دنیا میں بس ایک ہی آدمی سمجھنے کی اہلیت رکھتا تھا، اور وہ تھا فیکا پہلوان۔

عجیب بات یہ تھی کہ جسمانی طور پر فیکا پہلوان جتنا بے ڈھنگا اور بے ڈول واقع ہوا تھا، اس کے گلے میں اتنا ہی رچاؤ، سُر، اور سوز تھا۔ نعت پڑھے، یا ٹپے گائے، لوگ سننے کے لئے ٹھہر جاتے۔ گو کم ہی اونچی آواز میں کچھ گاتا۔ چھتر سائیں جتنے فحش گو اور طبیعت کے کھردرے تھے، اس کے بالکل برعکس فیکا پہلوان اتنا ہی خوش گلو، خوش گو اور خوش اخلاق تھا۔ عوامی حافظے میں اخلاق سے گرا ہوا کوئی ایسا لفظ نہیں تھا جو کبھی اس کی زبان سے نکلا ہو۔ یہ اس کی آنکھوں کی حیا ہی تھی کہ عورتیں بھی اس ڈیرے پر آتی اور فیکے پہلوان سے ہی رجوع کرتی تھیں۔ اس سے اپنے بیمار بچوں پر ہاتھ پھرواتیں۔ اس سے تعویز گنڈا کرنے کو کہتیں جو وہ نہ کرتا۔ بس ہر ایک کو دیہاتی ڈسپنسری کے کمپاؤڈر کی طرح، جو ڈاکٹر کی جگہ بیٹھا ہو، ایک ہی طرح کی گولیاں تھما دیتا جو ہر بیماری میں تیر بہدف ثابت ہوتیں۔ فیکے کے پاس بھی ایسی ہی ایک گولی تھی: "سدا سکھی رہو۔ سب دلدّر دور ہو جائیں گے۔ سب چکر ہے قسمت کا۔ اچھے دن آئیں گے۔ اس کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔" وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسا دلاسہ تھا، اور ایسے معصومانہ اعتماد کے ساتھ دیا جاتا کہ وہاں آنے والی عورتوں کی زندگیاں بدل کر رکھ دیتا۔ ان ہی عورتوں میں ایک میری دوسری ماں بھی تھی۔

مجھے کبھی پتہ ہی نہیں لگ سکا کہ وہ اس ڈیرے پر منتیں ماننے آتی تھی۔ شاید اپنی دائمی بیماریوں کے علاج کے لیے یا پھر کیا معلوم کس لیے۔ میں ذرا فاصلے پر فٹ پاتھ پر ہی ایک کھوکھے کے باہر بنچ پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ وہ چوک کی پرلی طرف رکشے سے اتری۔ پھر سڑک پار کر کے سیدھی فیکے پہلوان کے پاس گئی۔ فیکے پہلوان نے معصومیت کے ساتھ، جیسا کہ وہ ہمیشہ ایسے موقعوں پر کرتا تھا، اپنا سر جھکا لیا اور آنکھیں موند لیں اور یوں ظاہر کیا جیسے وہ بس اسی سائل کے انتظار میں تھا کہ وہ آئے اور اس سے اپنا دکھڑا بیان کرے۔

جانے وہ اس سے کیا کہتی رہی۔ پھر اس نے شاپنگ بیگ میں لپٹی مٹھائی کی پوٹلی سی اپنی چادر میں سے نکال کر اس کی طرف بڑھائی جو اس نے ہاتھ بڑھا کر تھام لی۔ پھر جو کچھ ایسے موقعوں پر وہ اکثر کہا کرتا تھا' ایسی ہی تسلی کی کوئی بات اس نے میری ماں سے کہی ہوگی۔ جسے اس نے سر جھکا کر اور شاید آنکھیں موند کر، پورے انہماک سے سنا۔ وہ اٹھی تو میں بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کھوکھے کی اوٹ میں ہو گیا کہ اسے دکھائی نہ دوں۔ وہ چھتر کے قریب گئی۔ ایک دھاگہ، یا کپڑے کی پتلی کترن چھتر کے ایک کونے سے ٹنگے دھاگوں میں سے ایک کے ساتھ باندھ دی۔ چھتر ایسی رنگ برنگی کترنوں سے' جو ہوا کے دوش پر لہرا رہی تھیں' لدا پھندا تھا۔

میرا ایف۔ اے میں داخلہ ہو گیا۔ تب میرا چھوٹا بھائی چھٹی اور بہن دوسری جماعت میں تھی۔ ہم تینوں صبح سکول اور کالج چلے جاتے۔

کالج کی مصروفیت شروع ہونے سے میرا روز روز لوہاری اور بھاٹی گیٹ جانا چھوٹ گیا۔ صرف جمعے کا دن میں وہاں دوستوں کے ساتھ گزارتا۔ کبھی کالج سے چھٹی کے بعد بھی چلا جاتا۔ چھتر سائیں کے ڈیرے میں ایک طرف اینٹوں کی تین کچی پکی دیواریں کھڑی کر کے بغیر چھت کے کمرہ سا بنا دیا گیا تھا جہاں مرادیں حاصل کر لینے والے سائل دیگیں لے کر آتے۔ ایک لنگر سا بن گیا جہاں تقریباً روز ہی کبھی میٹھے اور کبھی نمکین چاولوں کی دیگیں لائی جاتی تھیں۔ جمعرات کی رات کو البتہ وہاں عام دنوں سے زیادہ مجمع ہوتا۔ اس لنگر خانے کی وجہ سے علاقے بھر میں رونق تو ہوئی' وہاں مفت کی روٹیاں توڑنے والے بھک منگوں اور نشئیوں کا ٹھٹھ بھی ہر دم موجود رہنے لگا۔ وہ وہیں پڑے رہتے۔ کھانے کو مل گیا تو کھا لیا۔ ورنہ ایک طرف گندے نالے کے کنارے بیٹھ کر پنی لگائی یا چرس پی اور دنیا و مافیہا سے بے گانہ ہو کر پڑ رہے۔ کچھ خوانچہ فروش بھی وہاں فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ آن بیٹھے۔ اچھا خاصا میلے کا ماحول بن گیا۔

اس تمام ہنگامے کا مرکز چھتر سائیں تھے۔ لیکن وہ اس بڑھتی ہوئی رونق سے دن بدن زیادہ نالاں ہوتے گئے۔ اب ان کی گالیاں فٹ پاتھ پر چلتے لوگ بھی سنتے اور جب کبھی انہیں دورہ پڑتا تو اپنے چھتر کے ڈنڈے کو' جو لوہے کا تھا' دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اکھاڑنے کو ہوتے۔ لوگ کہتے ہیں ایک بار انہوں نے زمین میں اندر تک گھڑے ڈنڈے کو باہر کھینچ ہی نکالا تھا۔ اس کے بعد فیکے پہلوان نے ایسا انتظام کیا کہ اسے اکھاڑنا تو کجا' اپنی جگہ سے ہلانا بھی سائیں تو کیا کسی بھی انسان کے بس سے باہر ہو گیا۔ زمین میں گہرا گڑھا کھود کر اس میں پہلے اینٹوں کے چورے اور سیمنٹ بجری کی بھرتی ڈال کر اندر ڈنڈا اگاڑا گیا۔ پھر زمین کے اوپر چھوٹا سا تھڑا بنا دیا گیا۔ سائیں شاید اس اہتمام کو سمجھ گئے تھے۔ لہٰذا انہوں نے چند ایک بار ڈنڈے کو ہلانے کی کوشش کی۔ پھر اسے نہ چھوا بلکہ اپنا غصہ فیکے پہلوان کو دو ہتھڑوں سے پیٹ کر نکالتے۔ وہ دیو ہیکل آدمی اللہ کی گائے تھا۔ خاموشی سے مار کھاتا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں معصومیت کے ساتھ ساتھ مظلومیت کی سرخی بھر جاتی اور یوں معلوم ہوتا کہ وہ بس رو ہی دے گا۔ اوروں کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں، لیکن مجھے یہ منظر دیکھ کر طیش آ جاتا۔ سوچتا آخر وہ ایک ہاتھ انہیں مار ہی کیوں نہیں دیتا۔ سنگل پسلی سائیں تو اس کا کڑ کا سہارنے جوگے بھی نہیں تھے۔ لیکن دنیا کے رنگ نرالے ہیں۔ فیکا پہلوان بھی ایسا ہی ایک نرالا کردار تھا جس کے لئے میں ہمیشہ متجسس رہا۔

بی۔ کام کے بعد مجھے ایک جوتے بنانے والی کمپنی میں اکاؤنٹس کلرک کی نوکری مل گئی۔ اٹھارہ سو روپے تنخواہ مقرر ہوئی جو تب میرے جیسے اکیلے آدمی کے لئے تو بہت تھی۔ میری ماں کے لئے البتہ اس کی کچھ حیثیت ممکن نہ تھی۔ ستائیس سو روپے ماہوار تو وہ اپنے خانساماں کو دیتی تھی۔ میں نے اسے اپنی نوکری کی بابت بتایا تو اس نے بڑے تحقیر آمیز لہجے میں مجھے محنت سے کام کرنے کی تلقین کی اور تاکید کر کے کہا کہ دفتر میں اپنی روایتی کاہلی کا مظاہرہ نہ کروں۔ یہ صرف گھر میں ہی ممکن ہے کہ آدمی کچھ بھی نہ کرے اور پڑا بے کار کی مفت روٹیاں توڑتا رہے۔ دفتروں میں ایسا نہیں چلتا۔ مجھے اپنی کم تر حیثیت کا احساس دلانے، میری تحقیر کرنے اور میری سست طبیعت کو ہدف تنقید بنانے کا وہ کوئی موقع ضائع نہیں کرتی تھی۔ میرا بھائی البتہ ذرا مختلف طبیعت کا تھا۔ وہ اس کی بات نہ سنتا۔ آگے سے جواب تو نہ دیتا لیکن میری طرح تابعداری اور بے بسی سے سر جھکائے کھڑا نہ رہتا۔ لڑکے کی آنکھوں میں چھپی ہوئی بغاوت کی چمک ماں کو محتاط رہنے پر مجبور کرتی۔ یوں بھی وہ ذہین اور پر اعتماد لڑکا تھا۔ میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ پھر پری انجینئرنگ میں داخلہ لیا۔ اس کے سامنے ایک روشن مستقبل تھا۔

اپنی تمام ترخباثتوں کے باوجود ایک بات ہماری ماں میں اچھی تھی۔ ہماری تعلیم کا خرچہ وہ ذمہ داری کے ساتھ پورا کرتی۔ چاہتی تو ہمیں کب کا نکال باہر کرتی۔ ابو کی وفات کے بعد ہمارا اس پر حق ہی کیا بنتا تھا۔ لیکن شاید اس لئے کہ وہ خود بھی تنہا اور بیمار تھی، وہ ہم بہن بھائیوں کو ساتھ رکھنے پر مصر رہی۔ ہم سوتیلے ہی سہی لیکن وہ ہمیں کھونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تنہائی کی ماری ہوئی تھی۔ اس کے سبھی جاننے والے اس کی بدکلامی کی وجہ سے اس سے دور بھاگتے۔ اس کا کوئی قریبی رشتہ دار نہیں تھا۔ دور پار کا اگر کوئی عزیز تھا بھی تو وہ اس سے قطعی لاتعلق ہو چکا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی بھی اس کے پاس نہ ٹکا۔ ایف ایس سی کرنے کے بعد وہ کراچی یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی میں داخل ہوا اور پھر کبھی لاہور واپس نہ آیا۔ کچھ عرصہ تو وہ ماں سے خرچے کے لئے رقم منگواتا رہا۔ پھر شاید اس نے ٹیوشنیں وغیرہ پڑھانی شروع کر دیں اور اپنے خرچے کا بوجھ خود ہی اٹھانے لگا۔

مجھے نوکری کرتے چار سال ہو چکے تھے جب چھوٹے بھائی نے ہماری بہن کو جو میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی' اپنے پاس کراچی بلا لیا۔ وہ مجھے بھی کہتا رہا کہ چلے آؤ۔ کہیں نہ کہیں تمہاری نوکری کا بندوبست کر دوں گا۔ لیکن میں اپنی کینچلی میں دبکا رہنے والا آدمی ہوں۔ تجربات کرنے سے، رسک لینے سے ڈرتا ہوں۔ بس بیٹھا رہا۔ ماں کے گھر میں مجھے کرایہ دینے کی فکر تو نہیں تھی۔ وہ میرے ساتھ کیسی ہی بدسلوکی کرتی' مجھے گھر سے نکل جانے کو تو نہ کہتی۔ میرے لئے جیسا لاہور تھا، اس سے زیادہ غیر محفوظ اور اجنبی کراچی تھا۔ ایک دن ماں نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنے جاننے والوں میں ایک لڑکی میرے لئے دیکھی تھی جس کے والدین سے اس نے میری شادی کی بات بھی پکی کر دی تھی۔ مجھے بس اس نے اطلاع دی۔ پوچھا کچھ نہیں۔ میں نے ہمیشہ کی طرح اس کی بات پر صاد کیا۔

منگنی کے وقت میں نے لڑکی کو دیکھا تو مجھ سے اپنی خوشی اور حیرت چھپائی نہ گئی۔ وہ میری توقع کے برعکس خوبصورت تھی۔ شاید یہ پہلا اور آخری فیصلہ تھا جو ماں نے میرے حق میں درست کیا۔ ادھر چھوٹے بھائی نے' جو کیمیکل انجینئرنگ کی ڈگری لینے کے بعد ایک کمپنی میں خاصی معقول تنخواہ پر ملازم ہو گیا تھا' پھر سے مجھے وہاں آنے پر اصرار کیا اور کہا کہ اس نے اپنی کمپنی ہی میں میرے لئے بات کر رکھی ہے۔ لیکن میں اپنا شہر، لوہاری گیٹ، فیکا پہلوان، چھتر سائیں اور اپنی سوتیلی ماں کا گھر کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ میرا ابھی کچھ نہیں تھا۔ میں کسی دوسری مٹی میں کیسے جڑیں پکڑ سکتا تھا۔ پھر مجھے اس کا خط ملا کہ وہ ایک جگہ بہن کی شادی کر رہا ہے۔ شادی پر میں بھی گیا۔ ماں کو اس نے بلایا، نہ وہ گئی۔ مجھے البتہ اس نے جانے دیا، پتہ نہیں کیوں۔ خیر اس واقعہ کے کوئی چار ایک ماہ بعد ماں نے میری شادی بھی کر دی۔ اس نے میرے چھوٹے بھائی یا بہن کو نہیں بلایا۔ لیکن میں نے انہیں اطلاع دی اور وہ خود ہی چلے آئے۔

ماں نے اوپر کی منزل مجھے دے دی۔ وہاں الگ سے باورچی خانہ بھی تھا۔ لیکن کھانا نیچے اکٹھا ہی پکتا تھا اور یہ دستور ہمیشہ قائم رہا۔ میری تنخواہ پینتیس سو ہو گئی۔ جبکہ ہمارا خانساماں تینتیس سو روپے لے رہا تھا۔ میرے اور میری بیوی کے خرچوں میں یہ رقم ختم ہو جاتی۔ ماں کو میں کیا دیتا۔ چند سو روپے دیتے ہوئے ویسے ہی شرم آتی تھی۔ اس نے خود ہی کہہ دیا کہ اپنے خرچے پورے کر لو تو یہی بہت ہے۔ اتنی تنخواہ میں تو ہمارا خانساماں بھی کہتا ہے کہ اس کی پوری نہیں پڑتی، تمہاری کیا پڑے گی۔ یہ بات وہ میری بیوی کے سامنے کہتی تو مجھے لگتا اس نے مجھے سر عام ننگا کر دیا ہو۔ ایسا مجھے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا۔ یہی وہ تبدیلی تھی جو شادی کے بعد مجھ میں آئی۔ اب اس کی ذرا ذرا سی بات' جو وہ میری بیوی کے سامنے مجھے

کہتی، میرے دل پر چوٹ کرتی۔ مجھے طنز کے زہر میں ڈوبے نشتر سے زیادہ تیز لگتی۔ مجھے اپنا آپ اتنا حقیر محسوس ہوتا کہ میری زبان گنگ ہو جاتی۔ مجھ سے کوئی بات ہی نہ ہو پاتی۔

میری بیوی مجھ سے شکایت کرتی کہ آخر میں ایسی ذلت بھری زندگی کیوں گزار رہا ہوں۔ کہیں اور جا کر کیوں نہیں رہتا۔ لیکن میں پینتیس سو روپوں میں کہیں جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے ایک پرسکون ماحول کی عادت ہو گئی تھی۔ بڑا گھر، اٹیچ باتھ روم، اے سی، اچھا کھانا اور گھر کے بلوں اور دوسرے خرچوں کی ذمہ داری سے آزادی۔ ان آزادیوں کے ساتھ میں نے عمر کا بڑا حصہ اس گھر میں گزارا تھا۔ گھر کے جس حصے میں ہم میاں بیوی رہ رہے تھے اگر ایسا ہی کرایے پر تلاش کرتے تو پانچ چھ ہزار روپے سے کرایہ کم کیا ہوتا۔ میں اپنی تنخواہ میں واجبی سا گھر نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے بیوی کو یہ باتیں سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ سمجھ تو گئی کہ غریب گھر سے آئی تھی۔ ان باتوں کو سمجھتی تھی۔ لیکن میری ڈھٹائی اور تن آسانی اس سے ہضم نہ ہو پاتی۔ ماں جب کچھ زیادہ سخت سست کہتی تو کئی کئی دن میری بیوی کی تیوری نہ اترتی۔ جس طرح ماں کا نزلہ مجھ پر گرتا۔ اسی طرح بہو کا سینڈ بیگ بھی میں ہی بنتا۔ وہ بھی مجھ کو اپنی تمام تر بدبختی کا ذمہ دار ٹھہراتی۔

"تم کوئی اور اچھی نوکری کیوں نہیں تلاش کرتے۔ اپنے بھائی کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے۔ کراچی کوئی بری جگہ تو نہیں ہے رہنے کے لئے۔ کوئی پارٹ ٹائم کام ہی تلاش کر لو۔ یا مجھے کہیں نوکری دلوا دو۔ ہم پیسہ اکٹھا کر کے یہاں سے نکل جائیں گے۔"

میں خاموشی سے جیسے ماں کو سنتا' ویسے اسے بھی۔ ماں کو میں نہیں چھوڑ سکتا تھا کہ اس سے میری زندگی کی آسائشیں وابستہ تھیں اور نہ بیوی سے علیحدہ ہونے کا سوچ سکتا تھا کہ اگر یہ نہ ہوتی تو پھر یہ آسائشیں کس کام کی تھیں۔ سو دونوں کی خاموشی سے سنتا۔ میں پھر شاید اس لئے کہ عمر بڑھنے کے ساتھ باہر کی دنیا میں میری دلچسپی کم ہو گئی تھی، میں گھر پر ہی رہتا۔ خاص طور پر بیٹے عمران کی پیدائش کے بعد مجھے لگا کہ جیسے میری زندگی میں سوائے عزت کے کسی بھی شے کی کمی نہیں رہی۔

وہ بوڑھی ملازمہ اپنے معمول کے مطابق دو ایک ماہ بعد ماں سے ملنے آتی۔ اکثر اس کا بیٹا بھی ساتھ ہوتا۔ جب تک وہ وہاں رہتی' وہ بھی بیٹھا رہتا۔ وہ کوئی آدھا ایک گھنٹہ بیٹھتے اور پھر رخصت ہوتے۔ میں دکھائی دے جاتا تو ماں کی ناراضگی کے خوف سے ملازمہ مجھ سے سلام بھی نہ لیتی۔ میں بھی اس سے کنی کتراتا۔ نیچے ہی نہ اترتا۔ یا مجھے خبر ہوتی کہ اس وقت وہ دونوں ہوں گے تو گھر ہی نہ آتا۔ کسی دوست کے ہاں ٹھہر جاتا یا دفتر میں بیٹھا رہتا۔ وہ کبھی بھی ایک گھنٹے سے زیادہ وہاں نہ ٹھہرتے۔ دراصل میں ڈرتا تھا کہ ان دونوں کے سامنے ماں کہیں مجھے جھڑک ہی نہ دے۔ کتنی سبکی والی بات ہو گی۔

چار سال بیت گئے۔ ماں کو ذیابیطس ہو گئی تھی۔ ایک روز اس کی چیخیں سنائی دیں تو میں بھاگتا ہوا اس کے کمرے میں گیا۔ اس کی ٹانگ بے جان ہو کر مڑی ہوئی تھی۔ اس پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ فوراً میں نے ڈاکٹر کو فون کر کے بلایا۔ اس کے کہنے پر ہی میں ماں کو ہسپتال لے گیا۔ کوئی ہفتہ بھر وہ نیورو سرجیکل وارڈ میں رہی۔ پھر چلنے پھرنے جوگی ہو گئی تو ڈاکٹروں نے گھر واپس بھیج دیا۔ اس کے بعد وہ زیادہ تر اپنے بستر میں ہی لیٹی رہتی۔ چل پھر لیتی۔ لیکن زیادہ نہیں۔ بس شام کی واک کے لئے بہو کے ساتھ دو گلیاں چھوڑ کر پارک میں جاتی۔ میں گھر پر ہوتا تو مجھے ساتھ لے لیتی۔

وہ جتنی ہم میاں بیوی کی محتاج ہوگئی تھی، اتنا ہی اس کے مزاج کی چڑچڑاہٹ اور زبان کی کڑواہٹ میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ فالج کا حملہ دائیں ٹانگ پر ہوا لیکن اس کے اثرات جسم کے اوپری حصے پر بھی پڑے۔ خاص طور پر دایاں ہاتھ ناکارہ ہوگیا۔ بائیں ہاتھ میں کپکپاہٹ تھی۔ وہ کھانا خود سے نہیں کھاسکتی تھی۔ میری بیوی اسے کھلاتی۔ میں گھر پر ہوتا تو بیوی یہ کام میرے سر ڈال دیتی۔ ماں کھاتے ہوئے آدھا نوالہ باہر اگل دیتی جسے بار بار صاف کرنا پڑتا۔ میری بیوی کو یہ کام کھلتا تھا۔ میں ٹھیک طرح سے صاف نہ کرپاتا تو ماں تیخ پا ہوجاتی۔ منہ سے تھوکیں پھینکتی ہوئی مجھ پر برس پڑتی۔ میں نے تب اس کے سامنے زبان نہیں کھولی تھی جب وہ ہٹی کٹی تھی۔ اب تو ہاتھوں پیروں سے رہ گئی تھی۔ سو خاموشی سے اس کی پھٹکار سنتا۔ لگتا تھا وقت نے مجھے زیادہ ڈھیٹ اور اپنی نظر میں زیادہ حقیر بنادیا تھا۔ اب حالت یہ ہوئی کہ وہ مجھے میری بیوی اور بچے کے سامنے بھی ڈانٹتی، لعنت ملامت کرتی، میں خاموشی سے سنتا اور بعد میں ذراسی کوشش سے خود کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہوجاتا کہ بیمار آدمی کی پھنکار سے بھلا کیا ذلت، کیسی بے عزتی۔

میں نے بچے کو سکول میں داخل کیا تو فیس کا ذمہ ماں نے اپنے سر لے لیا۔ مجھے اپنی بیوی کو سمجھانے کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ ہمیں ہر صورت میں خود کو یہ زندگی جینے پر مجبور کرنا چاہئے، ایک اچھے مستقبل کی امید میں جو ہم سب کا تھا، میرا، میری بیوی اور میرے بچے کا۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا یہ انتظار کتنا طویل ہوگا۔ صبر کے بعد میٹھا پھل تو ملتا ہے، لیکن جتنی کڑواہٹ انسان اس مٹھاس کی خواہش میں سہار جاتا ہے، اس کا تو کوئی بدل نہیں، اس کا تو کوئی مداوا نہیں۔ اور اگر اس انتظار کے بعد مٹھاس کو محسوس کرنے والی حس ہی مرچکی ہو تو وہ ایک الگ قصہ ہے۔

میری شادی کو کوئی گیارہ سال ہوگئے تھے جب ایک دن میں دفتر سے چھٹی کرکے کسی کام سے براندرتھ روڈ گیا۔ واپسی پر میں بھاٹی گیٹ گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے وہاں چھتر سائیں کے ڈیرے کی جون ہی بدلی ہوئی دیکھی۔ سائیں کا وصال ہوئے دو سال ہوچکے تھے۔ گڑھے کی جگہ ان کا چھوٹا مگر وجیہہ مزار ایستادہ تھا۔ آس پاس کچھ رقبے میں سنگ مرمر کے فرش والا کشادہ صحن تھا۔ ایک طرف چھوٹی سی گلی بنی تھی جس میں لنگر خانہ تھا۔ باہر فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ کتنی ہی دکانیں پھولوں، قرآن مجید اور سپاروں اور مذہبی کتابوں اور طرح طرح کے پتھروں والی انگوٹھیوں، اور حمدوں، نعتوں کی کیسٹوں وغیرہ کی کھل چکی تھیں' روشنیوں میں نہائی اور خوشبوؤں میں بسی ہوئیں۔ میں مزار کے بڑے دروازے سے، جس کی پیشانی پر ''حضرت علم دار حسین پیر چھتر سائیں سرکار رحمتہ اللہ علیہ'' جلی حروف میں لکھا تھا، اندر کشادہ احاطے میں داخل ہوا۔ ایک طرف مزار کا حجرہ تھا جس کے دروازے کے باہر کچھ عورتیں اور مرد بیٹھے اور کھڑے تھے۔ اندر سبز چادر سے ڈھکی ہوئی قبر دکھائی دیتی تھی۔ میں اس ارادے سے آگے بڑھا کہ فاتحہ پڑھوں کہ میری نظر بائیں جانب ایک چبوترے پر پڑی جو بہت کشادہ تھا اور جس پر بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ اس کے باوجود کہ لوگوں کی کافی تعداد اس احاطے میں موجود تھی' سارے میں تقدس بھری خاموشی کا راج تھا' چبوترے کے پرلے کنارے کے قریب میں نے پہلی نظر میں پہچان لیا کہ فیکا پہلوان بیٹھا تھا۔

اس کے چہرے پر تو وقت نے کچھ اثرات نہیں چھوڑے تھے' لیکن اس کے سر کے گھنگھریالے بال سفید ہوگئے۔ سفید داڑھی میں کالے بالوں کی دھاریاں آگئی تھیں۔ لیکن بہت نمایاں فرق اس کے جسم میں یہ آیا کہ وہ بے طرح پھیل گیا تھا۔ وہ چوکڑی مارے بیٹھا تھا اور اس کی گود میں خوب ابھری ہوئی توند ایسے دھری تھی جیسے یہاں پڑی سستا رہی ہو۔ فیکے کے چہرے پر ایسا سکون اور شانتی تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ فیکے کا

یہ روپ کم از کم میرے لئے تو بالکل اجنبی تھا۔ میں آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب گیا۔ لوگ آتے تھے اور سبز چوڑی چنری اوڑھے اس سادھو کے گھٹنوں کو چھوتے۔ تب میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں معصومیت اور طفلانہ حیرت تو بدستور موجود تھی لیکن ایک احساس اضافی اور بہت نمایاں تھا، کامیابی، افتخار اور اعتماد کا احساس۔ ایسا احساس جو زندگی بھر کی تپسیا کے بعد ملنے والی کامیابی سے انسان کی ذات میں ہویدا ہوتا ہے۔ اس احساس کی بڑی چکا چوند تھی جس نے میرے اندر بھی چانن بھر دیا' امید کا چانن۔ میں نے آگے بڑھ کر چھتر سائیں کے جانشین کے گھٹنے کو چھوا۔ وہ ایسی سرشاری اور از خود رفتگی میں مست تھا کہ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کوئی آیا اور کسی نے اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا تھا۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ مسجد میں مغرب کی اذان بلند ہوئی۔ میں جا کر صحن میں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھے مزار کے گنبد پر، جو اس وقت سورج کی سرخ ہوتی روشنی میں دہک رہا تھا' کبوتروں اور چڑیوں کے غول بیٹھے دکھائی دیئے۔ مجھے اپنا جسم تھکاوٹ سے چور محسوس ہوا۔ میری آنکھیں تھکن کے بوجھ تلے بند ہونے لگی تھیں۔

منتظر

آنکھوں پر موٹے شیشوں اور پلاسٹک کے چوڑے فریم والی عینک لگائے ہوئے یہ جو پینتیس چھتیس سال کی عمر کا نوجوان ہے' برے حالوں میں' ڈھیلی سی چال چلتا ہوا فٹ پاتھ پر جیسے رینگ رہا ہو' کیا آپ اسے جانتے ہیں؟ یہ کوئی بے روزگار ڈگری ہولڈر یا ذہنی طور پر سٹکا ہوا شخص نہیں ہے۔ جی ہاں' یہ وہی شاعر ہے جسے چند ہفتے پہلے آپ نے ٹی وی میں ایک مشاعرے میں دیکھا ہوگا۔ اس کی آواز آپ نے ضرور ریڈیو میں بھی سنی ہوگی' کبھی نظمیں پڑھتے ہوئے' کبھی کسی پروگرام کی کمپیئرنگ کرتے ہوئے۔ اور کچھ نہیں تو اخبار کے ادبی ایڈیشنوں میں اس کی تصویر تو آپ نے ضرور دیکھی ہوگی۔ خیر اگر آپ اسے نہیں جانتے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ پھر واقفیت کا کیا ہے۔ نہیں ہے' تو اب ہو جائے گی۔

یہ چلتے ہوئے وقفے سے سر اٹھاتا اور اوپر آسمان کی طرف دیکھتا ہے' جانے کیا۔ بس ایک اچٹتی سی نظر ڈالتا ہے' آہ سرد بھرتا ہے اور سر گرا لیتا ہے۔ اتنا نیچے لے آتا ہے سر' کہ یہ قمیص کے اوپر کے بٹن کو مس کرنے لگتا ہے۔ جانے اسے کیا پریشانی ہے۔

یہ بھی کوئی اس کا جاننے والا ہی لگتا ہے جس نے پہلے ہاتھ ہلا کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا اور پھر آگے بڑھ کر خوش دلی سے بغل گیر ہوا ہے۔ ہاتھ میں پکڑی چائے کی پیالی کو اس نے شاعر کی طرف بڑھاتے ہوئے شاید چسکی لگانے کی پیشکش کی ہے۔ شاعر نے سر انکار میں ہلا کر کچھ کہا ہے جس کے جواب میں واقف کار نے چائے کے کھوکھے والے کو' جس کے قریب یہ دونوں کھڑے ہیں' ایک اور چائے بنانے کا اشارہ کیا۔ دونوں کچھ دیر کھڑے باتیں کرتے ہیں۔ پھر بنچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔

کھوکھے والے نے چائے کی پیالی شاعر کی طرف بڑھائی جسے اس نے آگے بڑھ کر تھام لیا۔

شاید دوست نے اس سے تازہ کلام سنانے کی فرمائش کی ہے۔ شاعر ہاتھ میں پکڑی ڈائری کھولتا ہے۔ صفحے الٹ پلٹ رہا ہے۔ پھر ایک جگہ رک کر ڈائری کو چہرے کے قریب کر لیتا ہے۔ کچھ پڑھ رہا ہے' ضرور تازہ کلام۔ دوست چہرے پر سنجیدگی طاری کر لیتا ہے۔ جیسے شعر سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ہولے ہولے سر ہلاتا ہے جیسے داد دے رہا ہو۔

اب یہ دونوں چل پڑے ہیں ٹی ہاؤس کی طرف۔ جہاں یہ پھر سے چائے پئیں گے اور دوستوں سے گپ شپ کریں گے۔ چوک پار کر کے یہ اسی پیپل کے درخت کے قریب سے گزرتے ہیں جس کے تلے میں کھڑا ہوں۔ مجھے شاعر کی اتنی بات سنائی دیتی ہے' ٹریفک کے شور میں کہ "کچھ ہو نہیں رہا بڑے عرصے سے۔" میں تو کہتا ہوں یہ واقف کار بھی ضرور شاعر ہے۔ دو شاعر ایک دوسرے سے دل کے پھپھولے پھوڑ رہے ہیں۔

ٹی ہاؤس زیادہ دور نہیں ہے۔ یہ پرے سائیکلوں کے ٹائروں کی بڑی دکان کے پہلو میں ہی تو ہے۔ یہاں آپ کو ادیب اور شاعر وغیرہ بیٹھے دکھائی دیں گے' خاص طور پر شام کے بعد۔ شاعر نوجوانوں کے ایک گروہ میں بیٹھ جاتا ہے۔ ٹی ہاؤس کا دروازہ کسی کے آنے یا جانے سے کچھ دیر

کے لیے کھلتا ہے تو شور کا بھبھکا سا اندر سے باہر کو لپکتا ہے' سگریٹ کے دھوئیں میں بھیگا ہوا۔

کوئی چار ایک سال پہلے شاعر نے بی اے کیا تھا۔ پھر کچھ عرصہ ایک اخبار میں کام کیا۔ اب کسی نجی ادارے میں اکاؤنٹس کے شعبے میں ملازم ہے۔ کسی ادبی رسالے کا مدیر بھی ہے۔ ریڈیو وغیرہ کے لیے بھی لکھتا ہے۔ اچھا خاصا کماتا ہے۔ اس کے باوجود اس کے چہرے پر شادابی اور رونق عنقا ہے۔ تناؤ اور انتشار ذہنی کی کیفیات اس پر مستزاد ہیں۔

ہاتھ میں پکڑا سگریٹ جلتا اور راکھ بنتا فلٹر کے بھورے کاغذ تک آ گیا ہے۔ راکھ کی ڈنڈی جیسے تیسے استوار ہے۔ ہاتھ کی ذرا سی جنبش اسے راکھ میں بدل کر میز پر بکھیر دے گی۔ چائے کی پیالی میز پر پڑی کب سے شاعر کا منہ تکتی ہے۔ اس میں سے بھاپ کی لکیر اٹھنی کب کی موقوف ہو چکی ہے۔ پیالی کے برابر کلپ بورڈ میں کاغذ لگے ہیں۔ ان پر قلم لیٹا ستا رہا ہے۔ پاس ہی ٹیبل لیمپ روشن ہے اور کمرے کی تاریکی میں ایک محدود رخنہ ڈالنے میں کامیاب ہے۔ روز ایسا ہوتا ہے۔ قلم ستاتا رہتا ہے۔ پیالی شاعر کا منہ تکتی ہے اور سگریٹ آپ ہی آپ جل کر راکھ بن جاتا ہے۔ پر کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی اگر کچھ ہو بھی جائے تو شاعر اس سے مطمئن نہیں ہوتا۔ صفحہ پھاڑ کر میز کے نیچے خلا میں اچھال دیا جاتا ہے۔ میز کے نیچے ایسے چرمر کئے ہوئے کاغذوں کی بڑی تعداد جمع ہو چکی ہے۔

جس دکان سے شاعر سگریٹ خریدتا ہے' اس کے اوپر ایک فلیٹ میں نوجوان صحافی رہتا ہے یہ شاعر جتنا پریشان حال تو نہیں لیکن اس سے زیادہ غیر مطمئن اور ناآسودہ ہے۔ برابر ہی پلازے میں اس کے اخبار کا دفتر ہے جو ملک کے معدودے چند کثیر الاشاعت اخباروں میں سے ایک ہے۔ دفتر کیا ہے' ایک ریاست ہے۔ چار منزلوں میں اتنے کمرے اور چھوٹی چھوٹی اتنی گلیاں ہیں کہ ان میں کچھ دیر موڑ کاٹتے رہنے کے بعد یوں لگتا ہے' آپ کسی بھول بھلیوں میں پھنس چکے ہوں۔

ان سینکڑوں کمروں میں سے یہ ایک نسبتاً بڑا کمرہ ہے جس میں نیم دائروی شکل کا میز پڑا ہے۔ ساتھ ساتھ کئی کرسیاں ہیں۔ ایک کرسی پر نوجوان صحافی سر جھکائے بیٹھا ہے۔ سامنے میز پر ایک طرف چند مڑے تڑے مگر کچھ کچھ سیدھے کیے گئے کاغذ پڑے ہیں۔ یہ اس کے نوٹس ہیں۔ ان کی بنیاد پر وہ ایک کالم یا فیچر لکھنا چاہ رہا ہے۔ انٹرو نہیں سوجھ رہا۔ بار بار بالوں میں ہاتھ سے کنگھی کرتا ہے۔ ماتھے پر اگرچہ وہ بالکل خشک ہے ہاتھ پھیرتا ہے جیسے پسینہ پونچھ رہا ہو۔ کبھی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لیتا ہے۔ قلم کو میز کی سطح پر بجاتا ہے۔ آنکھوں کے کناروں پر انگلی کے پوٹے پھیر کر میل صاف کرتا ہے۔ کبھی سر جھکا لیتا ہے اور کبھی اٹھا کر گردن کو دائیں بائیں جھلاتا ہے جیسے بہت تھک گیا ہو۔ یہ سب کچھ وہ مسلسل کرتا ہے لیکن انٹرو نہیں لکھا جاتا۔

بات شروع کی جائے یوں کہ جس میں چونکا دینے کی کیفیت ہو' پڑھنے والا سانس روکے فوراً متوجہ ہو جائے' یہ اس کا خاص انداز ہے۔ لیکن لگتا ہے یہ انداز اس سے کھو گیا ہے۔

چار سال پہلے یونیورسٹی سے صحافت میں ایم اے کی ڈگری لیتے ہوئے' اپنے جیسے دوسرے نوجوانوں کی طرح کیسے کیسے خواب اس نے دل میں سجائے تھے۔ دنیا کو بدل دینے' سچ لکھنے' تہلکہ مچا دینے کے خواب۔ کتابوں کی وساطت سے اسے عملی زندگی سے جو جان پہچان حاصل تھی' اس کی بنا پر وہ ان خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کا پورا حوصلہ بھی رکھتا تھا۔ لیکن یہ جان پہچان گنجان ٹریفک والی سڑک کی ایسی تصویر کی مانند تھی جس میں دکھائی

دینے والا دھواں آپ کو پھیپھڑوں کا کینسر نہیں کرتا۔

شروع شروع میں کچھ مشکل ہوئی تھی۔ خبر ڈھونڈنے میں' رپورٹ لکھنے میں' صحافی برادری میں اپنی جگہ بنانے میں۔ لیکن پھر راستے کھل گئے۔ گاہے بگاہے کہیں' اسے ایسی خبر مل جاتی جس سے صحافتی برادری اور عام قارئین کے حلقے میں اس کا چرچا ہوتا۔

لیکن اسے شکوہ ہے کہ گاہے بگاہے کیوں۔ ہر بار کیوں نہیں۔ ہر روز کیوں نہیں۔ ہر ایسی بڑی خبر کے بعد اسے ایک عرصہ کیوں چالو خبروں کے ساتھ گزر اوقات کرنا پڑتی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اس معمول کو بھی اوکھے سوکھے ہو کر اپنا لیا تھا۔ لیکن اس بار تو حد ہو گئی۔ کتنے مہینے ہو گئے تھے' اس کا کشکول خالی تھا۔ اسے معمولی خبروں کی جگالی کرنی پڑ رہی تھی۔ پریس کانفرنسیں' میونسپل کارپوریشن کی خبریں' شہر کی ڈائری۔ چڑیا مارنے کے لیے توپ چلانا بیوقوفی ہے۔ سو چالو خبروں کے لیے تجمل خواری کرنے کو فضول قرار دے کر سارا سارا دن پریس کلب میں صوفے پر نیم دراز پڑے رہنے کو اس نے اپنا وطیرہ بنا لیا تھا۔ کہ ایسی خبریں تو وہاں بیٹھے بٹھائے مل سکتی تھیں۔

جب سے یہاں ٹی وی کے ساتھ کیبل لگی تھی' صحافیوں کے وارے نیارے ہو گئے تھے۔ ان کی بڑی تعداد ایسی تھی جو وہاں سے ٹلنے کا نام ہی نہ لیتی۔ کچھ تو ایسے تھے' اور چند مہینوں سے وہ بھی ان میں شامل تھا' جو صبح وہاں آجاتے' شام کو نکلتے' اخبار کے دفتر جاتے' خبر لکھ کر جمع کرواتے اور واپس گھر جانے سے پہلے پھر سے دو ایک گھنٹے پریس کلب میں ڈیرہ جماتے۔ یہاں ٹی وی کے علاوہ بھی کئی صورتیں تھیں دل پرچانے کی۔ ٹیبل ٹینس تھا' شطرنج اور کیرم بورڈ تھا اور کچھ نہیں تو باہر لان میں بیٹھ کر بھرے ہوئے سگریٹ اور حتیٰ کہ شراب پی جا سکتی تھی۔ نوجوان صحافی اس منظر کا حصہ تھا لیکن مشین میں لگے ایسے پرزے کی طرح جو اصل میں اس مشین کے لیے بنا ہی نہ ہو۔ کھڑکھڑاتا ہو۔ دوسرے پرزوں کے ساتھ جم کے نہ چلتا ہو۔ ان سے کھیتا ہو۔ روز رات کو اسے دن ضائع ہو جانے کا دکھ ہوتا' پچھلے دن کی طرح۔ روز وہ خود سے کچھ باتیں طے کرتا اگلے دن کے لیے' اور روز انہیں کرنا بھول جاتا۔

باتوں باتوں میں آپ کو گورکن کے بارے میں بتانا تو بھول ہی گیا۔ یہ اس کہانی کا تیسرا اہم کردار ہے۔ اس کا نام حمید ہے یا نذیر یا شاید ظہیر' نہیں یار محمد' تو گورکن یار محمد شہر کے شمال مغرب میں واقع ایک قبرستان میں متعین ہے۔ آس پاس علاقہ ذرا نیا ہے۔ پتہ نہیں یہاں لوگ کم رہتے ہیں یا مرتے کم ہیں' مہینے بھر میں اسے سرکاری معمولی تنخواہ کے علاوہ اتنی یافت نہیں ہوتی کہ گھریلو خرچوں کا بوجھ احسن طور پر اٹھا سکے۔ پوری تو خیر اس کی اس تنخواہ میں کبھی نہ پڑی لیکن خاص طور پر جب سے اس کی بیوی پیٹ سے ہوئی تھی' کئی خرچے فوری طور پر بڑھے اور کچھ کا مستقبل میں بڑھنے کا واضح امکان پیدا ہو گیا تھا۔ آمدنی تو نہیں بڑھی' مالی پریشانیاں بڑھیں۔ خرچے زیادہ اور آمدنی کم۔ بکری کی کھال میں ہاتھی گھسیڑنے والی بات تھی۔ اب یہ کھال کیسے بڑی ہو' یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

یار محمد قناعت پسند انسان تھا۔ لیکن خرچے تو شور مچاتے بھوکے بچوں کی طرح ہوتے ہیں۔ قناعت کی چوسنی سے نہیں بہلائے جا سکتے۔ بیوی الگ کڑھتی اور اسے کوستی۔ اس حالت میں اتنی تشویش نہ زچہ کے لیے اچھی تھی' نہ اس کے پیٹ میں پلنے والے بچے کے لیے۔ لیکن وہ کڑھے نہ تو کیا

کرے۔ کمانا مرد کا کام ہے' وہ اس سے نہ کہے تو کس سے کہے۔

یار محمد نماز پڑھنے کے بعد اپنی مشکلات کے حل کے لیے دعا مانگتا۔ لیکن صاف یہ دعا بھی نہیں کر پاتا کہ موتیں زیادہ ہوں' کہ آمدنی میں اضافے کی اس کے علاوہ تو اور کوئی صورت نہیں تھی۔

نماز پڑھنے کے بعد وہ مسجد کے باہر کتبے بنانے والے کی دکان پر بیٹھ جاتا۔ یہ اس کا بچپن کا دوست ہے۔ دونوں کے پاس ہمیشہ ڈھیروں ایسی باتیں ہوتی جو سارا دن کرتے اور بور نہ ہوتے۔ رات وہ دیر ہی سے گھر لوٹتا۔ بیوی اگر وہی روز کا خرچوں کی زیادتی والا سبق رٹنے لگتی تو یار محمد کے حواس اور ذہن تھکن اور نیند کے بوجھل پن کے غلاف تلے بلٹ پروف بن جاتے۔ بیوی کی جلی کٹی باتیں خالی کارتوسوں سے زیادہ موثر نہ رہتیں۔

کئی ماہ پہلے اخبار میں یہ خبر چھپنے سے کہ حکومت سرکاری ملازموں کی تنخواہیں بڑھانے کا ارادہ رکھتی ہے' اسے امید بندھی تھی۔ اتنے عرصے میں اس کے آثار تو کچھ بھی ظاہر نہیں ہوئے تھے لیکن وہ مایوس نہیں تھا۔ وہ پرنے سے ماتھے پر پسینہ پونچھتے ہوئے اپنے سنگ تراش دوست سے کہتا ''رب دے گھر دیر ہے' انھیر نئیں۔'' اس بات سے بھلا کیا سنگ تراش یا کسی کو بھی انکار ہو سکتا تھا۔ سو کسی نہ کسی حیلے سے یار محمد نے امید کے ننھے دیئے کی لو کو مدھم نہ ہونے دیا۔

دن گزرتے گئے حتیٰ کہ ایک دن صحافی حسب معمول خود کو صوفے پر دراز کئے کیبل پر ہندی فلم دیکھ رہا تھا کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ سکرین پر ایڈیٹر کا نام دیکھ کر وہ چونکا۔

اسے بتایا گیا کہ شاہدرہ سے کوس بھر آگے 'ٹانواں پنڈ' کے قریب جی ٹی روڈ پر ٹریفک کا حادثہ ہوا تھا۔ وہ سرعت سے اٹھا اور موٹر سائیکل دوڑاتا بیس ایک منٹ کی مسافت کے بعد جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ پولیس وہاں موجود تھی۔ فائر بریگیڈ والے آگ بجھانے میں جتے ہوئے تھے۔ اخبار والا البتہ وہ پہلا ہی تھا۔ اس بات نے اسے مزید چوبند اور پرجوش بنایا۔

بچوں کی سکول بس' جو ہرن مینار کے ٹور سے لوٹ رہی تھی' ایک آئل ٹینکر سے ٹکرائی اور دونوں لڑھک کر سڑک سے نیچے نشیبی علاقے میں جا گرے۔ ٹینکر سے تیزی سے بہنے والے پٹرول نے دیکھتے ہی دیکھتے اردگرد خاصے علاقے کو چھوٹے سے تالاب میں بدل دیا۔ کسی کو آگے بڑھ کر زخمیوں کو بچانے کی ہمت نہ ہوئی۔ پندرہ تو بچے ہی تھے۔ چار پانچ لوگ سکول کے سٹاف کے تھے۔ ڈرائیوروں اور کنڈیکٹر سمیت بیس سے زیادہ لوگ تھے جو جل مرے۔

چشم دید گواہوں سے اسے پتہ چلا کہ ایک رکشے والے کے لالچ کے سبب یہ تباہی پھیلی۔ اس نے مسجد میں ہونے والے تنبیہی اعلان کے باوجود پٹرول کے تالاب میں سے ایک کنستر بھرا اور اسے رکشہ میں رکھ کر انجن سٹارٹ کیا۔ اسی لحہ انجن میں چنگاری بھڑکی اور آگ کا گولہ بن کر ہر طرف پھیل گئی۔ اس کا رکشہ بھی نہ بچ سکا۔ وہ بھی آگ کی لپیٹ میں آیا لیکن جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ پولیس آگ بھڑک اٹھنے کے بعد وہاں پہنچی۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں تو اس سے بھی بعد۔

صحافی نے کمال مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مرنے والے بچوں کے والدین کے تاثرات قلم بند کئے۔ اس اندوہناک حادثے سے

متعلق شہر کی معروف شخصیات سے انٹرویوز کیے۔ فوراً ایک ضمیمہ شائع کیا گیا۔ اگلے دن کے اخبار کا فرنٹ پیج صحافی لے اڑا تھا۔ آٹھ کالمی سرخی کے نیچے پورے صفحے پر حادثے سے متعلق کئی چھوٹی خبریں موجود تھیں۔ عرصے بعد صحافی کا نام خبر کے ساتھ چھپا تھا۔ اتنی کوریج کسی دوسرے اخبار نے نہیں کی تھی۔ اگلا پورا ہفتہ وہ حادثے کا فالو اپ لینے میں بے حد مصروف رہا۔ پریس کلب جانا تو جیسے چھوٹ ہی گیا۔

شہر بھر میں اس خبر قیامت خیز نے تہلکہ مچا دیا۔ ہمارا شاعر تو یوں غم والم سے نڈھال ہوا جیسے یہ بچے اسی کے تھے۔ راتوں کو بے چینی سے اٹھ جاتا۔ بچوں کی چیخوں کی آوازیں اس کے کانوں میں گونجتی اور کلیجہ کاٹ کر رکھ دیتی تھیں۔ دکھ کے بوجھ سے اس کا دل پھٹ ہی جاتا اگر یہ کیفیت الفاظ میں ڈھل کر کاغذ پر منتقل نہ ہوتی۔ اس نے مرنے والوں کے کرب، ان کے لواحقین کی اذیت اور شہر میں پھیل جانے والے سوگ کی کیفیت کو ایسے پر اثر انداز میں شعر کیا کہ جب یہ نظم اخبار میں چھپی تو شاید ہی کوئی پڑھنے والا ایسا ہو جس کی آنکھیں اشکبار نہ ہوں۔ پھر تو ایسی نظموں کا تسلسل بندھا جنہیں پڑھ کر وہ ردی کی ٹوکری کی نذر نہ کرتا، چھپنے کے لیے بھیج دیتا۔ جیسے تخلیق کا ریلا کہیں رکا پڑا تھا اور اب ہر بند توڑتا بہہ نکلا ہو، بس ایسی ہی کیفیت تھی۔

سکول جس میں یہ بچے پڑھتے تھے، شہر کے شمال مغربی حصہ میں واقع تھا۔ پندرہ بچوں کی میتیں یار محمد ہی نے دفن کیں۔ اتنا کام تھا کہ ایک مزدور اسے دیہاڑی پر اپنے ساتھ لگانا پڑا۔ سارا دن اور ساری رات وہ سانس لیے بغیر قبریں کھودتا اور بھرتا رہا۔

اس واقعہ کو ہوئے کافی دن ہو چکے تھے۔ ایک رات کھانا کھانے کے بعد سونے کے لیے لیٹتے ہوئے یار محمد سے اس کی بیوی نے فرمائش کی کہ عید قریب ہے اور وہ چاہتی ہے کہ جو پیسے اس نے کچھ دن پہلے اسے جمع کروائے تھے، ان میں سے دو بندے اپنے لیے بنوا لے جن کی ایک مدت سے اسے خواہش تھی۔ یار محمد، جس کے دل پر پندرہ شناخت نہ کیے جا سکنے والے بچوں کی تدفین کے بعد سے ایسا بوجھ پڑا تھا کہ ہٹائے نہیں ہٹتا تھا، نے تھکی تھکی آواز میں اس سے کہا ''پیسے تو آنی جانی شے ہیں۔'' پھر اس نے ہوکا بھرا ''ماپے تو جیتے جی مر گئے ان بچوں کے۔ موت آئی ہوئی تھی اسی لیے ٹور پر گئے وہ۔ اپنے بچے کو میں بہت پڑھاؤں گا پر کبھی سکول کے کسی ٹور کے ساتھ نہیں بھیجوں گا۔ کبھی نہیں۔۔۔'' یہ کہتے ہوئے یار محمد خاموش ہو گیا کیونکہ اس کا گلا رندھ گیا تھا اور آواز غم کے بوجھ سے بھاری ہو کر اندر ہی کہیں دب کر رہ گئی تھی۔

گڑھے کھودنے والا

تڑ، تڑ، تڑاخ، تڑاخ۔ سر میں پٹاخے سے چھوٹ رہے تھے۔ جیسے کوئی اندر ہی اندر آتش بازی کر رہا ہو۔ اس نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اٹھ بیٹھا۔ چند لمحے پہلے وہ دھماکے سے پھٹتے آتش فشاں کا خواب دیکھ رہا تھا جو ایسا ہولناک تھا کہ وہ اس کی تاب نہ لا سکا اور نیند کے اس طرف بھاگ آیا۔ لیکن اس شور سے فرار شاید ممکن نہیں تھا کیونکہ یہ بھی اس کے پہلو سے بندھا ہوا ادھر کھنچا آیا تھا۔

کمرے کی فضا اسا ڑھ کے امس سے شرابور تھی۔ چھت سے ٹنگا پنکھا گویا ناراضگی کے تاثر کے ساتھ آہستہ آہستہ 'گھوں گھوں' چل رہا تھا۔ اس نے باتھ روم میں ٹونٹی سے ٹپکتے پانی کے قطروں کی ٹپ ٹپ سنی اور ان کی مسلسل بڑھتی بھاری گونج کو محسوس کیا۔ ایک طرف دیوار میں باہر سڑک کو کھلتی کھڑکی کا ایک پٹ کھلا تھا اور غیر مرئی ہوا کے زور پر اپنے ہی قبضوں پر چرچراتا ہوا جھول رہا تھا۔ سڑک سے رات کے دوسرے پہر کی نیم جان ٹریفک کی بڑبڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔

اس نے درد سے بھنچی ہوئی آنکھوں سے جھولتے ہوئے پٹ کو دیکھا جو وقفے وقفے سے تیزی سے کبھی تو باہر لپکتا اور کبھی واپس چوکھٹے سے آلگتا۔ اس نے بستر کی پٹی سے ٹانگیں لٹکا کر اندھیرے میں پیر ادھر ادھر گھسیٹے اور چپل تلاش کیے۔ پھر چلتا ہوا کھڑکی تک گیا۔ سر کا یہ درد جو برسوں سے اسے لاحق تھا، اس کی جان لے کر ہی چھوڑے گا۔ اس نے ایک ہاتھ سے دیوار کو تھام لیا۔ درد کے تیز دورے نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔ آنکھوں میں رنگ رنگ کی آتشیں تتلیاں تیر رہی تھیں اور اسے کچھ دیر ان تتلیوں کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر پٹ بھیڑا اور نیم اندھے پن کے ساتھ واپس بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ اسے والیم فائیو کی گولیوں کا خیال آیا جو اس درد سے چھٹکارا پانے کی آخری امید تھیں۔ اس نے برابر ہی پڑی تپائی کا دراز کھولا جس میں ایک چھوٹی شیشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ لیکن وہ خالی تھی۔ اس نے ڈھکن کھول کر شیشی کے اندر جھانکا تو فینائل جیسی تیز بو نتھنوں میں گھستی محسوس ہوئی۔ 'مادر چود' اس کے ہونٹوں پر جھاگ سی ابھر آئی۔

اسے یاد آیا، آخری تین گولیاں وہ سونے سے پہلے پانی کے ساتھ نگل چکا تھا۔ برس ہا برس کے استعمال سے گولیاں شاید اس کے لیے اپنی تاثیر کھو چکی تھیں۔ یہ اسے چند گھنٹوں کی نیند بھی نہ دے پاتیں۔ ہر روز آدھی رات کو وہ اس جان لیوا سر درد کے ساتھ بیدار ہوتا۔ عموماً وہ کوئی پر شور خواب دیکھتا۔ ایک خواب جو کائناتی چیخ پر مشتمل ہوتا جو اسے ہر سمت سے آتی سنائی دیتی۔ جس کا کوئی منبع معلوم ہوتا اور نہ کوئی ہدف۔ یہ اس کے اعصاب کو چیر کر رکھ دیتی۔ تب وہ خواب کے اس طرف بھاگ آتا اور جاگ اٹھتا۔ لیکن یہ شور۔ یہ تو ہر جگہ اس کے مقابل تھا۔ یہ تو اس کے اندر برپا تھا۔ سو کھڑکی کا پٹ بھیڑ دینے کے باوجود اس میں رتی برابر کمی نہ ہوئی۔

اسے تو یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ پہلی بار کب اسے یہ درد محسوس ہوا۔ شاید یہ ہمیشہ سے تھا یا کم از کم یہ تب سے تھا جب سے اس کی یادداشت کی

تشکیل ہوئی۔اس نے اس کے علاج کے لیے بڑی خواری اٹھائی۔ ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، یونانی طب۔ایک عرصہ تک اس درد کا لا حاصل علاج کرنے کی کوشش کے بعد اس کے سرکاری روحانی معالج نے اپنی آخری تشخیصی رپورٹ میں لکھا تھا کہ اس شخص کا سردرد کسی عارضے کے باعث نہیں ہے۔کام کی زیادتی، غیر متوازن غذا اور ناکافی نیند کی وجہ سے پیدا ہونے والی روح کی بے چینی، ازلی احساس گناہ اور موت کا خوف اسکے بنیادی اسباب ہیں۔ اس کا علاج قدرتی طور پر ان اسباب کو رفع کرنے کی صورت ہی میں ممکن ہے۔ یہ ایک غیر تسلی بخش اور غیر مکمل رپورٹ تھی۔ نہ معلوم وہ ڈاکٹر اپنے تربیت کے زمانہ میں کیا جھک مارتا رہا ہوگا اور کیونکر اسے اتنی اہم ڈگری کے اہل سمجھا گیا۔اس کی نا اہلی تو اسی سے ظاہر تھی کہ اس نے کبھی اس کی خواب والی توجیہہ کو قابل اعتنا نہ جانا اور نہ خواب کے شور والی بات ہی کبھی اس کے پلے پڑی۔ یہ سب کچھ سمجھے بغیر وہ کیا خاک رپورٹ لکھے گا۔اس نے ڈاکٹر کے دستخطوں والے نیلی سیاہی سے لکھے گئے دو ورقوں کو پھاڑ کر چار ٹکڑے کیا اور ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔اس درد کا اس کے پاس عارضی ہی سہی مگر آخری علاج والیم فائیو کی گولیاں ہی تھیں۔

ایک طرح کی نیم بصارت کے ساتھ، جو آنکھوں کے سامنے رنگ رنگ کے شراروں والے پٹاخے چھوٹنے کے باعث تھی، اس نے تپائی کا دوسرا دراز کھولا۔ یہ نسبتاً بھاری تھا۔ اندر مختلف النوع اشیاء پڑی دکھائی دیں۔ ایک سیاہ چمڑی جلد والی جیبی ڈائری تھی۔ایک پیڈ خالی صفحوں کا تھا۔ اس پر کمپنی کے نشان والی کاغذ کی پٹی لپٹی ہوئی تھی۔اسے یاد آیا بہت برس پہلے اس نے یہ پیڈ خریدا تھا لیکن اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ساتھ ہی چند بے ٹکٹ ڈاک کے لفافے تھے۔اسے سرخ ربر بینڈ میں بندھا ویزیٹنگ کارڈوں کا ایک بنڈل دکھائی دیا جس میں کچھ واقف کاروں اور بہت سے اجنبیوں کے کارڈز تھے۔اس نے سوچا کبھی فارغ وقت میں وہ ان کی پڑتال کرے گا۔وہ جانتا تھا ان میں کچھ تو ہمیشہ سے اس کے لیے بے فائدہ تھے کچھ اب تک ہو چکے ہوں گے۔اصل میں وہ اپنے ایک لنگوٹیے دوست کا کارڈ تلاش کرنا چاہتا تھا جو سکول کے زمانے کا دوست تھا اور برسوں سے اسی شہر میں کہیں اچھی ملازمت پر فائز تھا۔اتنے عرصے سے وہ ایک دوسرے سے نہیں ملے تھے کہ اب وہ ٹھیک طور سے اس کے چہرے کے نقوش کو بھی اپنے ذہن میں یاد نہیں کر پاتا تھا۔وہ مایوسی سے دراز بند کرنے کو تھا کہ اسے ذرا آگے نکڑ میں، جو کچھ اندر ہونے کے سبب تاریک تھی، غیر مانوس سی شے پڑی دکھائی دی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھایا۔ یہ ٹھوس، بھاری اور کھردری دھات کا ریوالور تھا۔لیکن یہ کس کا تھا۔اس نے ریوالونگ چیمبر کھولا۔ اندر دو گولیاں تھیں۔اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ یہ خطرناک شے اس نے کب خریدی تھی؟ کیا واقعی یہ اسی کا تھا یا کسی نے یہاں رکھوایا تھا۔اس نے سوچنے کی کوشش کی۔ اتنا تو طے تھا کہ یہ بہت عرصہ سے یہاں موجود تھا۔اسی لیے اس کے ذہن سے محو رہا۔شاید اسی نے کبھی کسی ضرورت کے تحت اسے خریدا ہوگا۔اس نے اسے ہاتھ میں تولا۔معلوم ہوتا تھا یہ ایک عمدہ شے تھی۔لیکن اس میں دو ہی گولیاں کیوں؟ باقی چار کیا ہوئیں۔انہیں چلایا جا چکا تھا یا اس میں فقط دو گولیاں ہی تھیں۔ کچھ دیر ریوالور کو ہر طرف سے ٹٹولنے کے بعد اس نے اسے واپس دراز میں رکھ لیا۔لیکن دراز بند نہ کیا۔ درد کی کہیں زیادہ شدید لہر نے سر کو گویا آہنی شکنجے میں کس لیا اور وہ اپنی جگہ پر بالکل بت بن گیا۔کیا وہ ہمیشہ یونہی اس اذیت میں مبتلا رہے گا۔

اسے یاد تھا بہت چھوٹی عمر میں، جب وہ گلے میں بستہ ڈال کر اور ہاتھ میں تختی لیے سکول جایا کرتا تھا، تب اس درد سے آشنا ہوا تھا۔ گھر والوں کا خیال تھا کہ یہ سردرد نظر کی بڑھتی کمزوری کے باعث تھا۔انہوں نے اسے عینک لگوانے کی تجویز دی۔لیکن ڈاکٹر نے چیک اپ کرنے کے بعد

اس کی آنکھوں کو مکمل صحت مند قرار دیا۔ تب یہ درد اس شدت سے بیدار نہیں ہوا تھا، جیسا یہ اب تھا حتیٰ کہ جوانی میں بھی اس کی شدت کم نہ تھی جب انسان کے کبھی اعصاب مثالی تنومندی کا نمونہ ہوتے ہیں۔ تاہم جب سے اس نے تعلیم سے فارغ ہو کر ملازمت اختیار کی تھی اور ماں باپ کی وفات کے بعد اپنے آبائی گھر اور گاؤں سے نکل کر شہر کے گنجان آباد علاقہ میں ایک فلیٹ میں آن بسا تھا، درد یہ صورت اختیار کر گیا تھا۔

اس کے علاج کے لیے ایک عرصہ تک وہ سائیں مبارک علی المعروف 'بابا کراماتاں والا' کے آستانے پر حاضری دیتا رہا۔ انہوں نے اسے نہار منہ پانی میں گھول کر پینے کے لیے تعویز دیئے اور چالیس دنوں کا پر خطر چلہ بھی کاٹا۔ لیکن درد میں پھر بھی افاقہ نہ ہوا۔ 'یہ عام درد نہیں ہے' بابا کراماتاں والا نے درد کی تشخیص یوں کی تھی 'یہ زہریلا بوٹا کسی کا لگایا ہوا ہے۔ کوئی غیر نہیں، اپنا ہی ہے۔ بڑا پکا کام ہوا ہے۔ ان بلاؤں سے سخت جنگ کرنی ہوگی۔'

اس نے سوچا ضرور اس کے بھائیوں میں سے کسی نے ایسا کیا ہوگا۔ وہ جائیداد میں سے اسے ایک ٹکا دینے کو تیار نہ تھے۔ اس نے تو کبھی تقاضا بھی نہیں کیا تھا۔ الٹا ان سے میل ملاپ ہی ترک کر رکھا تھا۔ لیکن انہیں کھٹکا تھا کہ وہ کبھی بھی اپنا قانونی حق جتانے پہنچ سکتا تھا۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ انہیں لکھ دے کہ وہ جائیداد میں اپنے حصہ سے دست بردار ہوتا ہے بشرطیکہ اس کے بھائی اسے ضمانت دیں کہ اس پر مزید ٹونا نہیں کریں گے اور یہ کہ جتنا کچھ وہ اس ضمن میں پہلے اس کے خلاف کر چکے ہیں۔ اس کا توڑ بھی بتائیں گے۔ ایک عرصہ تک وہ اس منصوبے پر سوچتا رہا۔ اسی دوران اسے اپنے چار میں سے ایک بھائی کی موت کی اطلاع ملی۔ وہ اس کے جنازے پر بھی نہیں گیا۔ نتیجتاً اس کے دیگر بھائیوں نے متفقہ طور پر اس سے اپنا ہر تعلق توڑ لینے کا اعلان کیا اور اسے 'برادری باہر' کر دیا گیا۔ بھائی کی موت کے بعد سے یہ درد بھی زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ یقیناً باقی بھائی تین بھائیوں نے اس کے خلاف ٹونا ٹوٹکا تیز کر دیا تھا۔

وہ زندگی کے کسی بھی حصہ میں اس درد سے آزاد نہیں رہا۔ شاید یہ اس کے کسی پیدائشی جسمانی نقص کے باعث تھا یا کسی طور اسے وراثت میں ملا تھا۔ اس کی پچھلی نسلوں میں شاید کسی کو یہ عارضہ ہوا ہو۔

درد کا دورہ شدید ہوتا تو اسے آنکھوں کے آگے رنگ برنگی پھلجڑیاں چھوٹتی دکھائی دیتیں اور دماغ میں تڑاکے سے ہوتے جیسے اندر ہی اندر کچھ چیخ رہا ہو۔ اسے تپائی کا کھلا دراز بہت دور دکھائی دیا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور دراز سے ریوالور نکال کر اس کی نال کو کنپٹی سے لگایا جو سرد تھی۔ پھر آنکھیں میچ لیں اور ٹریگر دبا دیا۔

گولی چلنے کی آواز اسے سنائی نہیں دی۔ کچھ گرم لعاب سا اس کے یخ بستہ دماغ میں بھر گیا۔ اس کے ہاتھ کو تیز جھٹکا لگا اور وہ دھپ سے پیچھے بستر پر جا پڑا۔ گولی داہنی کنپٹی کی دیوار چیرتی ہوئی یخ بستہ دماغ میں بھرے سیال مادے میں لڑھکتے کسی گول پتھر کو ریزہ ریزہ کرتی دوسری کنپٹی سے باہر نکل گئی۔

صبح بیدار ہونے پر اس نے دیکھا کہ کنپٹیوں کے سوراخوں سے رستے سیاہی مائل خاکی کیچڑ نے اس کے چہرے، لباس اور بستر کو بھگو دیا تھا۔ یہ رات بھر اتنی مقدار میں بہا تھا کہ چارپائی پر بچھے گدے میں جذب ہونے کے بعد اس کی سطح پر تیر رہا تھا۔ اس کیچڑ میں لیٹے ہوئے اس نے

اپنے ہاتھوں اور پھر پورے وجود کو ہلایا جھلایا۔ خوشگوار حیرت کے ساتھ اسے احساس ہوا کہ وہ زندہ تھا۔ وہ ہنس پڑا۔ ہاتھوں کو آنکھوں کے آگے نچاتے اور انہیں جسم پر پھیر کر اسے محسوس کرتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھا۔ سر سے درد یوں رفع ہو چکا تھا کہ لگتا اب کبھی نہیں پلٹے گا۔ فرش پر ریوالور پڑا تھا۔ اس نے جھک کر اسے اٹھایا۔ یہ بڑے کام کی چیز ہے۔ اس نے سوچا۔ پھر احتیاط سے اسے دراز میں رکھا۔ اس میں ابھی ایک گولی باقی تھی۔

خود کو ایسا تازہ دم اس نے بہت کم محسوس کیا تھا۔ کام کرنے اور زندہ رہنے کا یہ ولولہ تو ان دنوں بھی اس میں نہیں تھا جب وہ نیا نیا کالج سے فارغ ہوا تھا۔ جب دنیا بدل دینے کے اس کے خواب توانا اور جوان تھے۔ اس نے قدرے عجلت سے بستر کی چادر اور گدے کو تبدیل کیا۔ فرش پر بہے ہوئے کیچڑ، جو برسات کے موسم میں جسم سے اٹھتی پسینے کی بساندھ جیسی بو دے رہا تھا' کو پانی سے صاف کیا۔ غسل خانے میں جا کر فرسٹ ایڈ کا ڈبہ نکالا۔ پہلے زخموں کو جن کے کنارے بارود کی وجہ سے جل کر سیاہ ہو چکے تھے، اچھی طرح سے دھویا۔ ایک اندھا راستہ سر کے آر پار دونوں کنپٹیوں کے بیچ تراز و ہو گیا تھا۔ اس نے روئی کے دو برابر حجم کے پھاہے بنائے۔ انہیں دائیں بائیں دونوں سوراخوں میں دبا کر ٹھونس لیا۔ اوپر سے کس کر سفید پٹی باندھ لی۔ پھر اس نئے میک اپ کے ساتھ خود کو آئینے میں دیکھا۔

'بھیڑ نہیں لگتا' اس نے سوچا۔ آٹھ بج کر تین منٹ پر وہ نئی اجلی سفید وردی پہن کر گھر سے نکل پڑا۔ دفتر پہنچنے میں اسے پچیس سے تیس منٹ لگیں گے۔ وہ معمول کی نسبت دیر سے روانہ ہوا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا شہر سے باہر کھدائی کے میدان تک' جہاں اس کا دفتر واقع تھا' اگر ذرا تیزی سے قدم اٹھائے تو سوا نو بجے تک پہنچ سکتا تھا۔

(۲)

شہر کے گرداگرد وسیع و عریض چٹیل میدان خاک اڑاتے لیٹے اونگھتے ہیں۔ ان میدانوں سے پرے بہت فاصلے پر سنگلاخ پہاڑی سلسلے ہیں۔ کہیں کہیں کچھ چھوٹے چھوٹے بارش کے پانیوں سے بھر جانے والے تالاب ہیں جن میں سال بھر شہر کا گندا پانی جمع رہتا ہے۔ شہر کے اندر البتہ بڑی عمارتیں ہیں جو ثقافت کے عمدہ شاہکار مانی جاتی ہیں۔ لوگوں نے مذہبی عبادت گاہیں بنا رکھی ہیں۔ بڑے بڑے سینما ہال ہیں جہاں ہر طرح کی ایکس اور بغیر ایکس کے فلمیں چلتی ہیں۔ رفیع الشان سٹیڈیم ہیں، پارک ہیں، تفریح گاہیں ہیں۔ کھلی سڑکیں ہیں۔ رہنے کے لیے فلک بوس محلات ہیں۔ لیکن شہر سے باہر دور دور تک ان چٹیل میدانوں اور سنگلاخ پہاڑیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان پہاڑیوں کے آگے گھنے جنگل ہیں جن میں سانبھر، ارنا بھینسے اور تیندوے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ دور دور سے لوگ یہاں شکار کھیلنے آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن شہر کے باسیوں کو شکار سے دلچسپی نہیں ہے۔ نہ ہی اتنا فارغ وقت ہے جسے وہ ایسے مشاغل میں صرف کریں۔ یہ کام کرنے اور ہمیشہ کام میں جتے رہنے والوں کا شہر ہے۔ شہر سے باہر جو وسیع و عریض میدان ہیں' انہی میں یہ لوگ تمام دن مختلف پیشہ وارانہ سرگرمیوں میں الجھے رہتے ہیں۔ جنوب اور مشرق میں سرکاری دفاتر ہیں۔ شمالی میدانوں کو نجی اداروں نے گھیر رکھا ہے۔ جبکہ مغربی علاقوں میں کسی قسم کی سرگرمی نہیں ہوتی۔ یہ بہت سرد میدان ہیں۔ ان میں بڑے بڑے ٹیلے ہیں جو اپنے عقب میں سنگلاخ پہاڑیوں کے ساتھ مل کر بحیرہ کیسپئین کی سمت سے آنے والی یخ ہواؤں کو اپنی چھاتیوں پر روکتے

ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو شہر کے لوگ سردی سے ٹھٹھر کر مر جائیں۔ ان میدانوں کی شہر کے باسیوں کے دلوں میں بڑی قدر و منزلت ہے۔

شہر کے لوگ تمام دن ان بیزار کن میدانوں میں جتے رہتے ہیں۔ تب شہر ویران رہتا ہے۔ شام کو وہ گھروں کو لوٹتے ہیں تو میدان برہنہ ہو جاتے ہیں۔ رات کولھے مٹکاتی ہوئی ان میدانوں میں بچھے ٹیلوں پر پاؤں پٹختی ناچتی ہے۔ ستارے تالیاں پیٹتے ہیں۔

جنوبی میدانوں میں سے ایک میں اس کا دفتر ہے۔ ایک چپٹے سرے والا ٹیلا اسکا استھان ہے جس کے بھٹ میں اس کی حاضری کا رجسٹر پڑا رہتا ہے۔ یہیں اس کے اوزار بھی ہیں۔ ٹیلے کا چپٹا سرا کافی چوڑا ہے۔ اس پر لیٹا تو نہیں مگر چوکڑی مار کر بیٹھا ضرور جاسکتا ہے۔ چاہو تو سکڑ سمٹ کر لیٹ بھی جاؤ۔

عموماً صبح سوا نو بجے تک وہ ٹیلے پر جا پہنچتا ہے۔ بھٹ میں سے رجسٹر نکال کر حاضری لگاتا ہے اور اگر کچھ جلدی نہ ہو یا کوئی فوری نوعیت کا کام کرنے کو نہ ہو تو ٹیلے پر چڑھ کر دو زانو ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں گھسیڑ کر نہ معلوم کیا بڑبڑاتا رہتا ہے۔ الہامی صحیفے کی ان گنت دعائیں اور منترا سے ازبر ہیں۔ پھر دیر تک سر کو اٹھائے، خالی ذہن کے ساتھ آسمان کو تکتا ہے۔ اس چند منٹ کی عبادت سے وہ بڑی تقویت حاصل کرتا ہے۔

ٹیلے کی کھوہ میں ایک طرف اس کا سامان پڑا ہے۔ ایک چمکدار پھل والا بیلچہ اور ایک چوبی گلی۔ وہ بیلچے کے پھل کی دھار پر ہاتھ پھیر کر اسکی تیزی کا اندازہ کرتا ہے۔ دھار جتنی تیز ہوگی اتنی ہی تیزی سے مٹی کو، جو دن بدن سخت ہوتی جا رہی تھی، اندر تک کاٹ کر رکھ دے گی۔ یہ دھار کبھی کند نہیں ہو پاتی۔ انتظامیہ کے کارندے اوزاروں کی جانچ باقاعدگی سے کرتے ہیں اور فوراً ہی اس بیلچے کو بدل دیتے ہیں جس کے پھل کی دھار انہیں ذرا سی کند محسوس ہو۔

ٹیلے سے کوئی نصف فٹ کے فاصلے پر وہ چوبی گلی گاڑ دیتا ہے۔ یہ وہ نشان ہے جہاں سے ہر روز کام کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ ٹیلے کی چاروں سمتوں میں کہیں بھی ہوسکتا ہے۔ مگر ہوتا یہ بس نصف فٹ دور ہی ہے۔ اس نشان سے وہ سات قدم مشرق کی طرف چلتا ہے۔ اگر اس سمت میں سامنے ٹیلا آجائے تو پھر اس کے برعکس مغرب کی سمت سات قدم اٹھاتا ہے۔ تب سورج افق میں نگاہ کی سطح سے کچھ اوپر ہوتا ہے۔ ہوا یہاں عام طور پر خوشگوار اور تازہ ہوتی ہے۔ دوسرے ٹیلوں پر بھی لوگ اپنی ڈیوٹی میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ وہ آسمان کی طرف نگاہ کرتا ہے۔ شام تک کے کام کا تصور کرتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے پاس وقت بہت کم ہے۔ ساتویں قدم پر کچھ توقف کر کے کہ یہی اس کا معمول ہے وہ ایک قدم مزید اٹھاتا ہے۔ نیچے جھک کر مٹی کو ہاتھ میں لیتا اور انگلیوں میں مسلتا ہے۔ مٹی پسے ہوئے دھان کی طرح نرم اور خالص ہے۔ کہیں کہیں اس میں ریت بھی ہے یا چھوٹے چھوٹے پتھر ہیں جو اسے قطعی پسند نہیں ہیں۔ ایسی مٹی پر وہ بے دلی سے کام کرتا ہے۔ اپنے بیلچے کے پھل کو پیروں کے نزدیک مٹی پر ٹکاتا اور پوری قوت سے اسے زمین کے دھڑکتے دل میں اتارتا ہے۔ پھر اس کے دستے کو لیور کی طرح نیچے دبا کر پھل کو مٹی کی ڈھیری کے ساتھ باہر نکال لیتا ہے۔

ڈھیری کو ایک طرف ڈال کر پھل کو پھر سے مٹی میں گھسیڑتا ہے اور یہی عمل دہراتا ہے۔ آہستہ آہستہ اپنے پیروں پر گھومتے ہوئے وہ ایک چھوٹے دائرے میں مٹی کھودتا اور اسے دائرے کے کناروں پر ڈھیر کرتا چلا جاتا ہے۔ گڑھا گہرا ہوتا اور وہ بتدریج اس کے اندر اترنا شروع ہو جاتا

ہے۔ حتی کہ گڑھے کے کنارے اس کی ناک کے پھننگ تک اوپر اٹھ آتے ہیں۔ وہ ہاتھ روک لیتا ہے۔ پیندے کی مٹی کو چھوتا اور اس ڈھائی فٹ محیط کے دائرے کی دیواروں کو ہاتھ مار کر ہموار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حتی کہ وہ بالکل سیدھی ہو جاتی ہیں۔ یہ گڑھا اسے اندھی کھوہ کی مانند معلوم ہوتا ہے جہاں اسے سو جانے کی خواہش ہوتی ہے۔ مٹی سے ٹھنڈی ہوائیں خارج ہوتی ہیں' اس کے پپوٹوں کو خمار کے بوجھ سے نیچے گرانے پر مائل۔ وہ قمیص کے کف سے ماتھے اور گردن پر سے پسینہ پونچھتا ہے جو ایسا سیاہی مائل ہو چکا ہے کہ کف پر سیاہ میل کے چتاخ پڑ جاتے ہیں۔ وہ گڑھے سے باہر نکل آتا ہے۔ اپنے ارد گرد نگاہ دوڑاتا ہے۔ دوسرے ٹیلوں کے قریب موجود مٹی کی ڈھیریوں سے وہ اپنے دفتری رفیقوں کے کام کی رفتار کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہ محض اندازے ہی ہیں۔ کبھی حتمی بات وہ نہیں جان پاتا۔ ہمیشہ اسے لگتا ہے کہ وہ ان سے سست ہے۔ اسے تیز تیز ہاتھ پیر مارنے چاہئیں۔ وہ مشرق کی سمت مزید سات قدم اٹھانے کے بعد آٹھویں قدم پر نئے سرے سے گڑھا کھودنا شروع کر دیتا ہے۔ ہر بار جب وہ گڑھے سے باہر نکلتا ہے، سورج کچھ مزید اوپر اٹھ کر زیادہ پر جوش اور گرم ہو چکا ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ ہوا کی خوشگواری کافور ہونے لگتی ہے۔ لو چلنے لگتی ہے۔ کاش اس کے چار ہاتھ ہوں' وہ سب کچھ نمٹا کر جلد گھر لوٹ اور سو سکے۔

وہ زوال آفتاب کے آغاز تک اتنی قدموں کی پٹی میں کل دس گڑھے کھودتا ہے۔ ہر گڑھا اپنے محیط میں برابر، اندرونی دیواریں گول اور ہموار اور گہرائی اس کی ناک کی پھننگ تک ہوتی ہے۔ دسویں گڑھے کی کھدائی کے بعد وہ ستانے کے لیے ٹیلے پر بیٹھ جاتا ہے۔ سائے دراز ہو رہے ہیں۔ پرندوں کی ڈاریں آسمان پر تیر رہی ہیں۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ اچھل کر ان میں سے کسی پرندے کو دبوچ لے اور اس کے نرم ریشمی پروں پر ہاتھ پھیرے اور اس کے گرم جسم کی کپکپاہٹ کو اپنی انگلیوں کی پوروں میں محسوس کرے۔ دوسرے ٹیلے فاصلوں پر ہیں۔ ان پر بیٹھے لوگ چاہیں تو پکار پکار کر آپس میں بات بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن ہر کوئی کام ختم کرنے کی جلدی میں ہوتا ہے۔ عام طور پر انہیں کام ختم کرنے کے بعد گھروں کو لوٹتے ہوئے ہی چند منٹ باہم گفت و شنید کے مل پاتے ہیں۔ لیکن تھکن اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ تب منہ کھول کر بات کرنے کو بھی جی نہیں کرتا۔

غروب آفتاب کے اختتام تک وہ تمام گڑھے بھر دیتا ہے۔

یہ نسبتاً سست عمل ہے اور کہیں زیادہ احتیاط اور مشاقی کا متقاضی بھی۔ پہلے دسویں گڑھے کو بھرا جاتا ہے۔ اس میں پہلے گڑھے کی مٹی ڈالی جاتی ہے۔ پھر پہلے گڑھے کو دسویں کی مٹی سے بھرا جاتا ہے۔ اسی طرح نویں اور دوسرے گڑھے کو ایک دوسرے کی مٹی سے پُر کیا جاتا ہے۔ آٹھویں اور تیسرے، ساتویں اور چوتھے اور چھٹے اور پانچویں گڑھے کو اسی کلیے کے مطابق ایک دوسرے کی مٹی سے بھر دیا جاتا ہے۔ یومیہ کام کا یہ حصہ اسے تھکن سے چور کر دیتا ہے۔ شاید اس لیے کہ یہ اختتامی مرحلہ ہے، وہ اسے مکمل کرنے کی خوشی میں سرپٹ بھاگتا ہے۔ دسویں گڑھے سے بیلچے میں مٹی اٹھا کر بھاگتا ہوا پہلے گڑھے اور پہلے گڑھے سے مٹی اٹھا کر دسویں گڑھے تک جاتا ہے۔ جوں جوں چھٹی کا وقت قریب آتا ہے' ایسی سرخوشی اس پر طاری ہوتی ہے کہ خود پر قابو نہیں رہتا۔ بار بار درمیان کے گڑھوں کے کناروں پر پڑے مٹی کے ڈھیروں سے ٹکرا ٹکرا کر لڑکھڑاتا اور گرنے کو ہوتا ہے۔ لیکن گرتا نہیں ہے۔ برس ہا برس کی ریاضت نے اس میں خود کو آخری لمحوں میں گرنے سے بچانے کا ہنر پیدا کر دیا ہے۔ گرنے کو ہونا اور پھر خود کو بچا لینا

اسے یہ ایک دلچسپ کھیل معلوم ہوتا ہے۔ یہ کھیل اس کے معمول کا حصہ ہے۔

اس کھیل سے اسے ایک طرح کا حوصلہ اور طمانیت بھی ملتی ہے۔ ٹھوکر کھانے کے بعد وہ دور تک لڑکھڑاتا چلا جاتا ہے۔ ہاتھ میں بیلچہ بلند ہے۔ سر آسمان کی طرف اٹھا ہوا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے جیسے تماشائیوں کے بہت بڑے مجمع کے سامنے سٹیج پر محوِ رقص ہو۔ اس کے پیر سنائی نہ دینے والی لے پر تھرکتے ہیں۔ سر میں مستی کا رس بھرا ہے۔ ایک طرح کی خود فراموشی کی کیفیت ہوتی ہے جس میں وہ بھاگتا ناچتا گڑھوں کو مٹی سے بھرتا چلا جاتا ہے۔

گڑھا بھر دینے کے بعد وہ اس پر بیلچے کے پھل کی پشت زور سے دھپ دھپ مارتا ہے۔ حتیٰ کہ مٹی کی سطح یوں پدھری ہو جاتی ہے کہ پہلی نظر میں گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہاں کبھی گڑھا تھا۔

کام مکمل کرنے کے بعد وہ روز کے معمول کے مطابق اردگرد نظر دوڑاتا ہے۔ ہر طرف دھول کا بادل چھایا ہوا ہے۔ لوگ کام ختم کر چکے ہیں یا ختم کر رہے ہیں۔ یہ زمین کبھی تو زرخیز ہوگی۔ وہ سوچتا ہے۔ لیکن اسے اس سے کیا؟ وہ کندھے جھٹکتا ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ مٹی کے بنجرپن کا علاج اس کی گوڈی کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ وہ سمجھتا ہے اگر ہم دس کے بجائے پانچ گڑھے کھودیں اور باقی وقت ٹیلے پر بیٹھ کر عبادت میں صرف کریں تو الہامی صحائف کے منتروں سے بھی یہ کام لیا جا سکتا ہے۔ اس تجویز کو وہ کونسل کے ممبران کے اجلاس میں پیش کرنا چاہتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ایک تو یہ اجلاس شام کو دفتری اوقات ختم ہو جانے کے بعد ہوتا ہے۔ دوسرے شہر کے نشیبی حصہ میں ہوتا ہے جہاں پہنچنے کے لیے اسے کم از کم دو گھنٹے کا پیدل سفر درکار ہے۔ وہ جانتا ہے ایسا شاید اس کے لیے کبھی ممکن نہ ہو سکے۔ کام ختم کرنے کے بعد وہ اتنا تھک جاتا ہے کہ اس کے پیر اگر دو سدھائے ہوئے جانوروں کی طرح اسے سیدھے واپس فلیٹ میں نہ لے آئیں، تو شاید وہ کہیں راستے ہی میں گم ہو کر فنا ہو جائے۔

(۳)

شام کو دفتر سے چھٹی کر کے وہ گھر لوٹتے ہوئے مارکیٹ گیا۔

یوں تو شہر بھر میں ان گنت مارکیٹیں ہیں۔ جہاں پہلے سانپوں اور بچھوؤں سے بھرے ہوئے گھنے درختوں والے جنگل تھے، انہیں کاٹ کر بڑے بڑے پلازے اور ریستوران ایستادہ کر دیئے گئے ہیں۔ درختوں میں کیڑا لگنے سے ان کے کھوکھلے تنے تیز ہواؤں کا سامنا نہیں کر پاتے اور ڈھے جاتے تھے۔ اس سے عام لوگوں کو بھی خطرہ تھا اور سرکاری تنصیبات کو بھی۔ شہر کی انتظامیہ نے کمال دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے چند برس پہلے ان کا صفایا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ منصوبہ تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ مارکیٹوں اور منڈیوں کی تعمیر دراصل انہی درختوں کی لکڑی کی مرہونِ منت ہے۔ ان کے ڈیزائن عالمی شہرت یافتہ ماہرین نے تیار کیے ہیں۔ دنیا بھر کا سامان آپ کو یہاں مل جائے گا۔ ہر طرح کے فیشن اور استعمال کی اشیاء بھی۔

ان مارکیٹوں کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ سرکاری ہیں اور کچھ نجی۔ سرکاری تعداد میں کم ہیں، مگر یہاں ہر شے نسبتاً کم قیمت پر ملتی ہے۔ کوئی بھی سرکاری ملازم اپنا کارڈ دکھا کر ان رعایتی قیمتوں سے استفادہ کر سکتا ہے۔ خاص طور پر وہ اشیاء تو نہایت کم قیمت پر دستیاب ہیں جو سرکاری ملازمین کے روز کے استعمال میں آتی ہیں جیسے دفتری وردیاں، اوزار، مختلف ادویات جیسے نیند کی گولیاں، شراب اور نشہ آور اشیاء جو اعصاب کو سکون دیں۔ اس

کے علاوہ جوگر شوز اور جینز وغیرہ۔ اس نے والیم فائیو کی گولیوں کی شیشی خریدی اور پتلون کی داہنی جیب میں ٹھونس لی۔

اس بات کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب وہ محض ایک گولی کھانے سے سکون کی نیند سو پاتا تھا۔ پھر یہ دو ہوئیں، اس کے بعد تین، اور اب یہ صورت تھی کہ روزانہ چار گولیوں کی خوراک لینے کے باوجود آدھی رات کو شدید سر درد کے ساتھ جاگ اٹھتا۔ تب ایک خوراک مزید لیتا۔

میڈیکل سٹور سے نکل کر اس نے کھوکھے سے گرد 300 راجہ جانی کا پان بنوایا اور کلے میں دبا کر چبانے لگا۔ فوراً ہی اسے اندازہ ہوا کہ پان فروش نے چونا زیادہ لگا دیا تھا جو اس کی زبان کاٹ رہا تھا۔ تاہم پان اس نے پھینکا نہیں۔ فٹ پاتھ پر چلتا رہا۔ بازار میں خوب گہما گہمی تھی۔ دکانیں جگ مگ جگ مگ کر رہی تھیں۔ شوکیسوں میں سجی ایک سے ایک بڑھیا چیزیں آنے جانے والوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ کیا بڑے کیا چھوٹے' ان شوکیسوں میں ایسی کشش تھی کہ وہ ان کی طرف کھنچے چلے آتے۔ ایک طرف شوکیس میں زندہ ماڈل نئے ڈیزائن کا لباس زیب تن کیے نیم برہنہ کھڑی تھی۔ نوجوان لڑکیاں ہی نہیں' لڑکے اور عمر رسیدہ افراد بھی اسے گھیرے ہوئے تھے۔

جہاں انتشار ہو وہاں آپ کو ہر رنگ کا آدمی مل جاتا ہے۔ جیب تراش اور باتوں سے پھسلا کر لوٹ لینے والے بھی یہاں بہت ہیں۔ خود وہ بھی ایک بار ان میں سے ایک کے ہاتھ کی صفائی کا شکار ہو چکا ہے۔ ذرا غور سے دیکھا جائے تو آپ کو ادھر ادھر ٹکڑوں اور فٹ پاتھوں پر عصمت فروش عورتیں اور مرد چلتے پھرتے دکھائی دیں گے۔ اصل کام بس اتنا ہے کہ آپ انہیں اور یہ آپ کو پہچان لیں۔ پھر وہ خود ہی آپ کو اشارہ کرتے ہیں۔ عموماً ان کے نرخ زیادہ نہیں ہوتے۔ پچھلے سالوں میں جنگیں زیادہ ہونے کی وجہ سے مرد تعداد میں کم ہوئے ہیں۔ عورتوں کی بڑی تعداد انہی برسوں میں اس پیشے میں داخل ہوئی۔ عصمت فروش مردوں میں زیادہ تعداد بیس سے تیس برس کے لونڈوں کی ہے جو نازک اندام اور عموماً خوب بھرے ہوئے جسم کے ہوتے ہیں۔ ان کے نرخ تو اس سے بھی کم ہیں۔ غربت زیادہ ہے نا، اس لیے۔ یہ مرد و زن بعض اوقات ویڈیو کی ایک کیسٹ یا کسی معمولی ریستوران میں ایک وقت کھانے کے عوض ساتھ چلنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ صبح ہونے تک کوئی گاہک نہ پھنسے تو بعض اوقات یونہی کسی کے ساتھ چل پڑتے ہیں۔ پیسہ ہی اصل مسئلہ نہیں ہے۔ زیادہ تر شغل میلہ کرنے اور مزے کی خاطر اس دھندے میں آئے ہیں۔

گداگر آپ کو ایسے کسی بھی بازار میں کوئی دکھائی نہیں دے گا۔ سرکاری بازاروں میں ان کا داخلہ ممنوع ہے۔ بازار سے نکل کر شہر کے مرکز کی طرف جاتی لنک روڈ پر چڑھیں تو ان کے جتھے کے جتھے دکھائی دیں گے جو فوراً آپ کو گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ آپ کے لاکھ جھڑکنے اور ملامت کرنے پر بھی آپ کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ تا آنکہ آپ جیب سے کچھ نکال کر انہیں دیں۔ کچھ ان ٹولیوں سے مڈبھیڑ ہونے کے اندیشے کے باعث اور کچھ اس لیے کہ وہ تھک چکا اور فلیٹ تک پیدل جانا اسے دوبھر لگ رہا تھا، اس نے ٹیکسی کروائی جس نے اسے منزل تک پہنچانے میں دس منٹ بھی نہیں لگائے۔ گداگروں کی ٹولیوں کے قریب سے ڈرائیور نے ایسی مشاقی اور تیز رفتاری سے ٹیکسی گزاری کہ وہ اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکے۔ بہت تجربہ کار ڈرائیور تھا۔ اس کا تو ان سے روز واسطہ پڑتا تھا۔

رات کو چار گولیوں کی خوراک پانی کے ساتھ نگل لینے کے باوجود وہ حسب معمول آدھی رات کو نہایت بے کلی کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔ اس بار سر کا درد فزوں تر تھا۔ وہ اس کی ٹیس اپنے دل اور پیروں کے ناخن تک محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کے بھڑے ہوئے پٹ کو دیکھا اور سمجھ گیا کہ

کمرے میں بھرا شور اس کے خوابوں ہی کی تلچھٹ تھی۔ اس لمحے جب سر کا نا قابل برداشت درد کنپٹیوں کی جھلی چیر کر پھوٹ بہنے پر آمادہ محسوس ہوا تو اس نے دراز کھول کر ریوالور نکالا۔ کچھ دیر اسے ہاتھ میں پکڑے جھلایا کیا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اس میں کوئی گولی موجود ہے یا نہیں۔ کل اس نے دیکھا تو تھا۔ ریوالونگ چیمبر خالی تھا یا؟ اس نے ریوالور کی نال ماتھے پر درمیان میں رکھی اور ٹریگر دبا دیا۔

گولی چلنے کی آواز اس بار بھی سنائی نہ دی۔ یخ سیال سے بھرے دماغ میں یکلخت کچھ گرم لعاب سا حلول کر گیا۔ گولی ماتھے کو چھیدتی کھوپڑی کی پشت میں سوراخ کرتی باہر نکل گئی۔ ریوالور نے اسکے ہاتھ کو پرے جھٹکا اور وہ دھپ سے پیچھے بستر پر چت جا گرا۔

صبح اپنی کنپٹی اور ماتھے کے زخموں کو میتھلیٹڈ الکحل سے دھو کر ان میں روئی کے چار پھاہے ٹھونستے اور ان پر سفید پٹیاں باندھتے ہوئے وہ آئینے میں خود کو دیکھ کر مسکرایا۔ جانے کیوں۔ اس نے سوچا شاید اپنے مسئلے کا ایک بہتر حل اس نے پا لیا تھا۔ اگر وہ یومیہ دو گڑھے اضافی کھودے تو ماہانہ ساٹھ گڑھوں کے اضافے سے اس کی تنخواہ بیس فیصد بڑھ سکتی تھی۔ یہ اضافہ ریوالور کی تیس گولیوں کی خریداری کے لیے شاید کافی ہو۔

شیو کرتے ہوئے وہ حساب لگانے لگا۔ مہینے کے ساٹھ اور سال کے 720 گڑھے ہوئے۔ دس گڑھوں کی ایک دیہاڑی بنتی ہے۔ 720 اضافی گڑھوں کا مطلب 72 اضافی دیہاڑیاں ہیں۔ ایک دیہاڑی کی اجرت سے اگر ریوالور کی دس گولیوں والا ایک پیکٹ خریدا جا سکتا ہے تو پھر سال بھر میں وہ 72 پیکٹ خریدنے کے قابل ہو گا یعنی 720 گولیاں جبکہ کل کھپت 365 گولیوں سے زیادہ شاید ہی ہو۔ 355 گولیوں کی بچت اس پر مستزاد تھی۔ یوں سارا معاملہ اس کے حق ہی میں جاتا تھا۔ خاص کر اس طرح فی ہفتہ والیم فائیو کی ایک شیشی کا خرچہ بھی تو اس کے ماہانہ بجٹ سے منہا ہو گا۔

تیز بارش میں ہونے والا واقعہ

چار بجنے میں ابھی سات ایک منٹ باقی تھے جب وہ گھر سے نکلا۔ تب تک آسمان دھوئیں جیسے سیاہ بادلوں سے ڈھک چکا تھا اور ہلکی ہلکی بونداباندی ہونے لگی تھی۔

'نیا بازار' سے ہوتا ہوا وہ میکلوڈ روڈ پر آیا۔ ایک رکشہ والے سے کچھ جھک جھک کے بعد کرایہ طے کیا اور اس میں سوار ہو کر ائیر پورٹ روانہ ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے دیکھتے دیکھتے بے ضرر سی بونداباندی تیز بوچھاڑ میں بدل گئی اور اسے نشست پر درمیان میں ہو کر بیٹھنا پڑا کیونکہ بارش کا پانی سڑک پر جمع ہو رہا تھا اور دونوں اطراف سے رکشے کے پہیوں کے زور سے پانی کے چھینٹے اڑ کر اس کی پتلون پر گر رہے تھے۔ گھر سے چلتے ہوئے اس نے ایک بڑی چھتری احتیاط ہمراہ لے لی تھی۔ تب اسے لگا تھا کہ وہ ایک اضافی بوجھ اٹھا رہا تھا۔ لیکن اب وہ مطمئن تھا۔ اس نے غلط فیصلہ نہیں کیا تھا۔ یہ لمبے سفر کا اچھا آغاز تھا۔

اس کا نام حمید ناصر تھا۔ وہ ایک دور افتادہ مقام شکار پور میں ایک انٹر کالج میں ریاضی پڑھاتا تھا۔ اس کا تعلق کسی زمین دار خاندان سے تو نہیں تھا پھر بھی اس کی پڑھانے کے علاوہ مصروفیت زراعت سے متعلق کتابوں کا مطالعہ اور اسی موضوع پر مضامین لکھنے پر مشتمل تھی۔ خود اس کا باپ ساری عمر ساہٹروں ماہٹروں والے چھوٹے چھوٹے کام کرتا رہا۔ ایک ہی بڑا کام اس سے ہو پایا کہ اس نے بیٹے کو پڑھا لکھا دیا اور اسے اپنے جیسا نہ بننے دیا۔ تاہم وہ بیٹے کو پروفیسر بنتے نہ دیکھ سکا۔ بیوی کی وفات کے ڈیڑھ ایک سال بعد وہ بھی چل بسا تھا۔ یہ کوئی تین ایک سال پہلے کی بات تھی۔

اس دور افتادہ مقام میں رہنے کے باوجود وہ زراعت سے متعلق لکھنے اور پڑھنے والے حلقوں میں ایسا گمنام نہیں تھا۔ خاص طور پر جب سے اس کا سیم وتھور کے موضوع پر مفصل تحقیقی مضمون چھپا تھا' اس کا نام ملک کے اہم ماہرین زراعت کے ناموں کے ساتھ لیا جانے لگا تھا۔

نیشنل ایگری کلچرل فیڈریشن کی جانب سے اسے قائم آباد میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ اور ہوائی جہاز کا ریٹرن ٹکٹ موصول ہوا تھا۔ کانفرنس میں بین الاقوامی شہرت کے حامل ماہرین زراعت شرکت کر رہے تھے۔ اس نے شب و روز کی محنت اور دقت نظری کے بعد مقالہ تیار کیا اور اب اسے ایک چرمی تھیلے میں ڈالے دونوں کہنیوں کے نیچے گود میں رکھے بیٹھا تھا۔

سڑک پر ایک مقام پر رکشے کے انجن نے معاً چند پھسپھسی آوازیں نکالیں اور کام کرنا چھوڑ بیٹھا۔ رکشہ اپنی رفتار میں چلتا ہوا کچھ دور تک گیا اور پھر رک گیا جیسے کہہ رہا ہو کہ اب اترو اور اپنا راستہ ناپو۔ ڈرائیور نے کچھ دیر انجن کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ کاربوریٹر میں پانی چلا گیا ہے۔ اسے کوئی مکینک ہی درست کر سکتا تھا۔ ظاہر تھا اسے ایئر پورٹ تک پہنچنے کے لیے کسی متبادل سواری کا انتظام کرنا ہوگا۔ وہ رکشے سے نیچے اتر آیا۔ بارش زور و شور سے جاری تھی۔ اس نے چھاتا کھول کر سر پر پھیلا لیا۔ رکشے والے نے کمال مہربانی کرتے ہوئے اس سے آدھا کرایہ

لیا۔ پیسے دے کر وہ ایک طرف فٹ پاتھ پر پھیلی ہوئی شاخوں والے ایک چوڑے درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

یہ ایک ویران ذیلی سڑک تھی اور مین روڈ سے، جو سیدھی ایئر پورٹ کو جاتی تھی' کافی فاصلے پر واقع تھی۔ رکشہ والے نے شارٹ کٹ کے چکر میں اسے اس خاموش جگہ پر لا پٹخا تھا اور اب رکشہ کو فٹ پاتھ پر چڑھا کر اس میں بیٹھا خاموشی سے سگریٹ پی رہا تھا۔ اسے کہیں بھی پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ لیکن اسے تو تھی۔ سو ضروری تھا کہ وہ یہاں کھڑا نہ رہے اور کوئی متبادل سواری تلاش کرنے کے لیے ہاتھ پیر مارے۔

اس نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ یہ ایک رہائشی علاقہ تھا۔ اطراف میں دو رویہ شیشم اور سفیدے کے درختوں کی قطاروں کے عقب میں چھوٹے بڑے خوبصورت بنگلے اور کوٹھیاں نظر آ رہی تھیں۔ شاید اس لیے کہ بارش بہت تیز تھی یا اس لیے کہ یہ شارع عام نہیں تھی، وہاں ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ کبھی کبھار کوئی کار فراٹے بھرتی اور پانی کے چھینٹے اڑاتی وہاں سے گزر جاتی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے لفٹ لینے کی کوشش کی لیکن یوں معلوم ہوتا کہ ان کاروں میں بیٹھے ہوؤں کو وہ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ پچیس منٹ کے وقفہ میں فقط تین کاریں وہاں سے گزریں اور کسی ایک نے بھی اس کے ہاتھ کے اشارے کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اسے لفٹ ملنے کی امید چھوڑ دینی چاہئے۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کے شیشے پر سے نمی پونچھ کر وقت دیکھا۔ پونے پانچ ہوئے تھے۔ فلائٹ کا وقت سات بجے تھا اور ابھی اس کے پاس سوا دو گھنٹے باقی تھے۔

وہ اپنے چرمی تھیلے کو بغل میں داب کر ایک طرف کوٹھیوں کے سلسلے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ یہ قطعی بے آباد کوٹھیاں معلوم ہوتی تھیں۔ خوب سجی ہوئی لیکن یکسر خاموشی سے اس کی اور دیکھتی ہوئیں۔ 'کتنی چپ ہے یہاں' اس نے اپنی عینک کے شیشے رومال سے پونچھتے ہوئے سوچا۔

کوٹھیوں کی بیرونی دیواریں مختلف طرح کی بیلوں سے اٹی ہوئی تھیں۔ عقب میں آم، جامن، امرود اور کہیں کہیں پیپل کے چوڑے اور خوب پھیلے ہوئے درخت دکھائی دیتے۔ اس سے آگے وسیع و عریض کشادہ لان اور بغیر دیواروں کے گیراج تھے۔

بارش کا زور بڑھتا جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کا شور بھی۔ کہیں لوہے کی باریک چادر پر پانی کی بوچھاڑ جلترنگ سی بجا رہی تھی۔ بڑے چھاتے کے باوجود اس کی پتلون گھٹنوں سے اوپر تک بھیگ گئی اور پانی اس کے جوتوں اور جرابوں میں گھس کر اس کے تلوؤں میں گدگدی کر رہا تھا۔ یہ جوتے اس نے خاص اس کانفرنس میں شرکت کے لیے خریدے تھے۔ ان کی یہ درگت بنتے دیکھ کر اسے دلی رنج محسوس ہوا لیکن کیا کیا جا سکتا تھا۔

بائیں جانب ایک مختصر مگر چوڑی گلی تھی جو قریب ایک فرلانگ کے فاصلے پر آگے سے بند ہوتی دکھائی دیتی تھی۔ وہ گلی میں داخل ہو گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ قریباً ایک کنال کے رقبہ پر پھیلے ہوئے ویران گھر کے سامنے رک گیا۔ اس کے صدر دروازے کے اطراف میں سرخ اور زرد پھولوں والی ڈیلیا کی بیل لپٹی ہوئی تھی جو اسے بہت پسند تھی۔

دروازے سے آگے کچھ رقبہ سبزہ زار پر مشتمل تھا۔ اطراف میں درخت تھے اور پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ عین وسط میں دروازے کے آگے اینٹوں کا غیر پختہ چند فٹ چوڑا راستہ تھا جو تیس چالیس قدموں کے فاصلے پر ایک رہائشی عمارت سے جا ملتا تھا۔ اس نے کال بیل کا بٹن دبایا جو اس کے دائیں طرف دروازے کے برابر دیوار پر لگا تھا۔ کہیں کوئی نیم پلیٹ نہیں تھی جس سے یہاں رہائش پذیر افراد کے بارے میں کچھ اندازہ ہوتا۔

بارش کا زور اس قدر شدید تھا کہ اسے گھنٹی بجنے کی آواز سنائی نہیں دی۔ تاہم اس کا خیال تھا کہ گھنٹی بجی تھی۔ رہائشی عمارت میں ایک کمرے کی کھڑکی کے

کھلے پٹ میں سے بجلی کے قمقمے کی روشنی چھن کر باہر آ رہی تھی۔ باقی ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ بس ایک ہی چیز زندہ، پرشور اور بھرپور تھی۔۔۔ بارش۔

کافی دیر تک اسے اندر کسی قسم کی حرکت کے آثار دکھائی نہیں دیئے تو اس نے دوبارہ بٹن دبایا اور دیوار کے سائے میں ہو کر کھڑا ہو گیا جہاں ڈیلیا کی بارش میں دھلی ہوئی بیلیں باہر جھول رہی تھیں۔ اس بار بھی اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے تیسری مرتبہ بٹن دبایا۔ مزید کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ گھنٹی خراب تھی۔ اس نے چوبی دروازے کو، جو خستہ حال تھا اور تیز بارش میں ایک بے کار پڑی ہوئی شے کی مانند دکھائی دے رہا تھا، ہاتھ سے معمولی سا دھکیلا تو وہ کمزور چولوں کے شور کے ساتھ، جو بارش کے تیز شور میں دب گیا تھا، اندر تک سرکتا کھلتا چلا گیا۔

رہائشی عمارت کا دروازہ بند تھا۔ ایک طرف دیوار میں کھڑکی کے کانچ کی چادر والے پٹ سے اندر کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ یہ دیوان خانہ تھا۔ بڑے جہازی صوفوں سے پرے آتش دان کے قریب ایک آرام کرسی پر ساٹھ پینسٹھ برس کی عورت فروکش تھی۔ اس کا دایاں رخ دروازے کی جانب تھا۔ اس کے سر کے بال دودھ کے سے سفید تھے اور ان کی ایک لٹ اس کی کنپٹی پر جھول رہی تھی۔

"واقعی گھنٹی خراب ہے۔" اس نے سوچا۔ پھر دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلیوں کے جوڑوں کی ہڈی سے کانچ کی چادر پر ضرب لگائی۔ عورت نے گردن پھیر کر اسے دیکھا۔ کچھ دیر بے دھیانی سے دیکھا کی۔ پھر قریب دھری تپائی پر سے چشمہ اٹھایا اور آنکھوں پر چڑھا لیا۔ کچھ دیر دیکھنے کے بعد ہاتھ کے اشارے سے اسے اندر آنے کو کہا۔

وہ اس کے سامنے پڑی دوسری آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ بہت نرم اور تسکین بخش نشست تھی۔ گیلے چھاتے کو وہ دروازے کی دہلیز پر ہی رکھ آیا تھا۔ دروازے کے ساتھ سٹول نما تپائی پر اپنا چرمی تھیلا ڈالا اور وہیں فرش پر اپنے جوتے اور جرابیں اتار کر رکھ دیں۔ یہ سارا عمل اس نے عورت سے اپنا تعارف کروانے سے پہلے کیا تھا۔ جیسے یہ طے تھا کہ اسے یہاں بیٹھ کر ستانے کی اجازت مل جائے گی۔

اس نے اپنے بٹوے میں سے، جس کی سطح نم آلود ہو چکی تھی لیکن اندر روپے اور دیگر کاغذات خشک تھے، اپنا کارڈ نکال کر اس عورت کو دیا۔ پھر اپنا مسئلہ بیان کیا کہ اسے ایئر پورٹ تک جانے کے لیے لفٹ کی ضرورت تھی۔ عورت نے کارڈ سرسری انداز میں پڑھا اور اسے لوٹایا۔ پھر سر کو پیچھے گرا کر آہستہ آہستہ اپنے ہاتھوں کو ملنے لگی۔ اس نے پروفیسر کی بات کا فوری جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ بہت تھکی ہوئی اور دائمی عارضہ میں مبتلا معلوم ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر نقاہت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی۔

'شاید یہاں یہ اکیلی ہی ہے۔' عورت کی خاموشی سے اس نے کچھ ایسا نتیجہ اخذ کیا۔ اس نے بغور عورت کے چہرے کو دیکھا۔ وہ گہرے سانس لے رہی تھی۔ اس کی چھاتی سے سیٹی کی آواز نکلتی تھی جس سے اسے اندازہ ہوا کہ عورت کو دمہ تھا۔ وہ کھانسنے لگی اور بار بار دوہری ہو جاتی۔ کچھ دیر بعد تیر کی طرح سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

پھر طبیعت سنبھلی تو خود ہی بتانے لگی کہ اس کا بیٹا اس کے لیے دوائیں لینے گیا ہوا ہے، واپس آ کے وہ آپ کو ایئر پورٹ چھوڑ آئے گا۔ آج اس کی طبیعت زیادہ خراب تھی۔ موسم نم آلود ہو تو اس پر بیماری کا حملہ ہوتا تھا۔ پھر اس نے بتایا کہ اس کا بیٹا بھی ایک مقامی کالج میں معاشیات کے مضمون کا لیکچرار تھا۔ ان دنوں اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس کے بعد کچھ دیر وہ موسم کے متعلق باتیں کرتے رہے جو غیر

متوقع طور پر شدید ہوگیا تھا۔ عورت کا خیال تھا کہ یہ جمعرات کی جھڑی تھی اور پورا ہفتہ جاری رہے گی۔ اس نے عورت کو اپنے بارے میں بتایا جسے وہ بڑے انہماک سے سنتی رہی۔ بیچ بیچ میں بادل کی گرج کمرے میں گونجتی اور آتشدان میں جلتی لکڑیاں کڑکڑاتی تھیں۔ پھر وہ دونوں خاموش ہوگئے۔ کھڑکی سے باہر شام کی سی نیم تاریکی چھاگئی تھی۔ بادل گھرے ہوگئے تھے اور لگتا تھا موسم دیر تک ایسا ہی رہے گا۔ تاہم وہ مطمئن تھا۔ اس کے لیے سواری کا بندوبست ہوچکا تھا۔

کچھ ہی دیر میں عورت کی حالت پھر سے خراب ہونے لگی۔ وہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھے ہولے ہولے کھانستی رہی پھر چھاتیوں پر ہاتھ جمائے دہری ہوگئی۔ وقفے وقفے سے چہرے کو اوپر اٹھاتی تو وہ خون کی طرح سرخ ہوتا۔ اس پر دمے کا شدید دورہ پڑا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے کرسی پر آگے ہوگیا۔ اس مشکل وقت میں اسے عورت کی مدد کرنی چاہیے۔ لیکن کیا کرے اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکا۔ پھر عجلت میں کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ عورت مکمل طور پر اپنے گھٹنوں پر جھک گئی تھی۔ پھر دفعتاً جھٹکے سے اس کا جسم بلند ہوا اور کرسی کی چوبی پشت پر جاگرا۔ وہ یکسر ساکت تھی اور اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی ہوئی تھیں۔ وہ سانس نہیں لے رہی تھی۔ اس نے عورت کی کلائی تھامی۔ اس کی نبض خاموش تھی۔

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ دیر تک وہ کچھ بھی نہیں سمجھ پایا۔ موت جتنی سادہ ہے' اتنی پیچیدہ بھی تو ہے۔ ایک عورت جو ابھی زندہ سامنے بیٹھی اس سے محوِ کلام تھی' اب کرسی میں مردہ حالت میں پڑی تھی۔ اس نے اسے بازوؤں میں اٹھایا اور صوفے پر لٹادیا۔ وہ پتلے جثے کی عورت تھی لیکن شاید موت نے اس کے وزن میں اضافہ کردیا تھا۔ کرسی سے صوفے تک لے جاتے ہوئے اسے سانس چڑھ گیا۔

اسے فوری طور پر کسی کو اس واقعہ کی خبر کرنی چاہیے۔ اس نے سوچا۔ کسی ڈاکٹر کو' یا کسی پڑوسی کو یا اگر کوئی اس گھر میں موجود ہوتو اسے۔ اس نے عجلت میں گیلی جرابیں اور جوتے پہنے جو بس معمولی سے خشک ہوئے تھے۔ ٹیلی فون کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ وہ اسے بغلی کمرے میں ایک تپائی پر رکھا دکھائی دیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے دوسرے کمرے میں داخل ہوا تھا جبھی اسے اوپر چھت پر کچھ کھڑکا سنائی دیا۔ جیسے اوپر کوئی تھا۔ کسی نے کوئی شے سرکائی تھی۔

وہ زینہ کی تلاش میں کمرے کی پرلی جانب نکل گیا۔ یہ ایک طویل اور چوڑا برآمدہ تھا۔ پرے سرخ قالین سے ڈھکی ہوئی سیڑھیوں والا زینہ موجود تھا جس کے اطراف میں چوبی کٹہرا بنا ہوا تھا جو زینے کے ساتھ ساتھ بل کھاتا ہوا اوپر کی منزل کو جاتا تھا۔ اپنی ساخت میں یہ کسی پرانی مگر غیر آباد حویلی کا زینہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اس پر چلتے ہوئے اسے اپنے قدموں کی واضح دھپ دھپ گونجتی سنائی دی جیسے اس کے نیچے کوئی بڑا پوشیدہ خلاء تھا۔ یہ مختصر بل دار زینہ اسے میلوں لمبی مسافت کے برابر معلوم ہوا اور وہ ہانپ گیا۔

اوپر دائیں جانب طویل راہداری تھی جس کے اطراف میں مختلف کمروں کے بند دروازے تھے۔ فرش پر دبیز اور نرم قالین بچھا تھا۔ سارے میں گہری خاموشی اور نیم اجالا سا پھیلا تھا۔ ایک طرف دیوار سے لگا کم واٹ کا زرد روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ ایک کمرے کے دروازے کا ایک پٹ معمولی سے کھلا تھا جس میں سے باہر آتی ٹیبل لیمپ کی روشنی کی زرد اور مہین لکیر فرش پر لیٹی سستا رہی تھی۔ کمرے سے کاغذوں کے الٹنے پلٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ سرعت سے آگے بڑھا اور دستک دینے کے تکلف میں پڑے بغیر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔

بائیں جانب میز اور کرسی پڑی تھی اور ایک پچاس پچپن برس کا شخص آنکھوں پر چشمہ لگائے بیٹھا تھا۔ نچلی منزل میں مردہ پڑی عورت سے اس کی گہری شباہت تھی۔ وہ کچھ لکھ رہا تھا لیکن اسے اندر آتے دیکھ کر قلم میز پر ڈال دیا اور اس کی جانب رخ کر کے ایک ٹک تکنے لگا۔

چند ثانیے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ بولا ''میرا نام حمید ناصر ہے۔ نیچے ایک خاتون مری پڑی ہیں۔ آپ ذرا میرے ساتھ نیچے آئیں گے۔''

اس شخص نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ردعمل کے طور پر اپنا چشمہ اتار کر کھلی کتاب پر، جو میز پر دھری تھی، ڈال دیا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولا، ''آپ کون ہیں۔''

''میں اپنے بارے میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا لیکن فی الوقت آپ میرے ساتھ نیچے چلیے۔ یہ بہت ضروری ہے۔''

''میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ کون ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں؟''

'میں کسی بری نیت سے یہاں نہیں آیا۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا لیکن فوری طور پر ہمیں نیچے چلنا ہوگا تا کہ اگر اس خاتون کی کچھ مدد کر سکتے ہوں تو کریں۔''

''کس خاتون کی بات کر رہے ہیں؟ یہاں کوئی خاتون نہیں رہتی لیکن آپ یہاں کیسے آئے۔''

''میں آپ کو ساری بات بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے ہمیں نچلی منزل میں اس خاتون۔۔۔۔۔''

''دیکھیے'' اس بار اس شخص کے لہجے میں درشتی اور ناراضی واضح تھی۔ ''آپ ایک ہی بات کی رٹ کیوں لگائے ہوئے ہیں۔ میں نے آپ سے کہا نا کہ یہاں کوئی عورت نہیں رہتی۔ نہ ہی آپ یہ بتانے پر تیار ہیں کہ آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟'' کچھ دیر وہ خاموش رہا۔ پھر بولا ''خیر جب کہ آپ یہاں آ چکے ہیں تو تسلی کے ساتھ بیٹھ کر بتائیے کہ آپ کو کیا پریشانی ہے۔''

کچھ دیر ہونقوں کی طرح بٹر بٹر اپنے پیروں کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد اس نے مختصر الفاظ میں یہاں اپنی آمد کی غرض و غایت اور پیش آمدہ تمام واقعات بیان کیے۔

''آپ کے بیان کردہ واقعات میں اس بات کے سوا کبھی سچ مانا جا سکتا ہے کہ آپ یہاں نیچے کسی عورت سے ملے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس گھر میں کوئی تہہ خانہ نہیں ہے کہ نیچے کی کسی منزل کا تصور کیا جا سکے۔ یہ ایک منزلہ مکان ہے۔ اس کے نہ اوپر کوئی منزل ہے اور نہ کوئی نیچے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہاں اس وقت میں اکیلا ہوں یا اب آپ میرے ساتھ ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ یہاں اور کوئی نہیں ہے۔ میرا ایک بیٹا میرے ساتھ رہتا ہے۔ لیکن اس وقت وہ یہاں نہیں ہے۔ وہ اپنے کسی دوست کی برتھ ڈے پارٹی میں گیا ہوا ہے۔ آج موسم صبح سے خراب ہے۔ لیکن یہ تو ہم جیسے بوڑھے اور بیمار لوگ ہی کہتے ہیں کہ یہ خراب ہے۔ جوان آدمی کے لیے تو اس میں بڑا تھرل ہے۔ میری عمر کو پہنچ کر بیماریاں پیچھا نہیں چھوڑتیں۔''

پھر وہ کھانسنے لگا جیسے اپنی بات کو ثابت کرنا چاہتا ہو کہ وہ واقعی بیمار تھا۔ مسلسل کھانسی سے اس کے چہرے کے اعصاب تن گئے اور آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ وہ کھانستے ہوئے بار بار دہرا ہو جاتا حتیٰ کہ ہانپنے لگا۔ اس کا نچلا جبڑا یوں نیچے تک ڈھلک آیا تھا جیسے کوئی بے جان عضو ہو۔ سینے سے

سیٹی کی تیز آواز برآمد ہو رہی تھی۔ اسے دمہ تھا۔ کچھ دیر کھانسنے کے بعد اس کی طبیعت سنبھلی تو بولا ''آپ بیٹھ جایئے۔ ہمیں اطمینان کے ساتھ بات کرنی چاہیے۔ شاید آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

وہ خاموشی کے ساتھ ایک موڑھے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کمرے میں گہرا سکوت چھایا رہا۔ پھر وہ بولا ''میں اس خاتون سے ملا ہوں۔ نیچے' میرا مطلب ہے کہ ڈرائنگ روم میں ان کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کا ایک بیٹا ہے جس کا نام شاید ریاض احمد ہے۔ وہ بھی کسی کالج میں پڑھاتا ہے اور آج کل پی ایچ ڈی کر رہا ہے۔ وہ اس کے لیے بازار سے دوائیں لینے گیا ہوا ہے۔ ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ شاید میں انہیں بچا سکتا تھا۔ لیکن وہ میرے دیکھتے دیکھتے مر گئیں۔ میں نے سوچا کسی ڈاکٹر کو فون کروں تو مجھے اوپر کھڑاک سنائی دیا اور میں یہاں آ گیا۔'' پھر وہ سر جھکا کر خود ہی کچھ بڑبڑانے اور سوچنے لگا جیسے اپنی ہی کہی ہوئی باتوں پر غور کر رہا ہو۔

''آپ نے نام صحیح بتایا'' وہ شخص بولا اور بیٹھے بیٹھے کروٹ بدلی۔ ''میرا نام ریاض احمد ہے۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ پی ایچ ڈی والا۔ ابھی تھوڑا ہی عرصہ پہلے یونیورسٹی سے ریٹائر ہوا ہوں۔ آپ نے خاصی عجیب بات کہی کہ آپ یہاں کسی عورت سے ملے ہیں۔ البتہ آپ کی بات سے برسوں پہلے کا ایک تلخ واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہوا ہے۔ ایسا ہی دن تھا۔ تیز بارش ہو رہی تھی۔ ایسے موسم میں میری والدہ کی طبیعت بگڑ جاتی تھی۔ انہیں دمہ تھا جو مجھے بھی وراثت میں ملا ہے۔ میں ان دنوں پی ایچ ڈی کے سلسلے میں مصروف رہتا تھا۔ دھیان ہی نہ رہا کہ والدہ کی دوائیں ختم ہو چکی ہیں۔ جلدی جلدی سے میں نے گاڑی نکالی اور بازار چلا گیا۔ راستے میں اس کا پہیہ پنکچر ہو گیا۔ مکینک کو ڈھونڈنے اور پنکچر لگوانے میں کچھ دیر ہو گئی۔ واپس آیا تو ماں کو صوفے پر مردہ لیٹے ہوئے پایا۔ اس بات کے لیے میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکا کہ آخری وقت میں ان کے پاس نہیں تھا۔ ضرور انہوں نے مجھے پکارا ہوگا۔ میرا نام لیا ہوگا۔ مجھے آخری بار دیکھنے کی خواہش دل میں لے کر وہ چلی گئیں۔ میں اگر ان کی دوائیں ختم نہ ہونے دیتا۔ تو اس دن یہیں ہوتا۔ انہیں بھلے نہ بچا پاتا لیکن۔۔۔'' اس کی آواز بھاری ہو گئی اور وہ چپ ہو گیا۔ جیسے گلے میں پانی بھر چکا ہو۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے پھر سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن گلے سے بس خرخراہٹ آمیز آوازیں ہی نکل پائیں۔ پھر اس نے حمید ناصر کی طرف دیکھا۔ بالکل خالی نظروں کے ساتھ اور بچوں کی طرح ہچکیاں لے کر رونے لگا۔

تادیر یہی کیفیت رہی۔ آخر اس کی طبیعت سنبھلی تو وہ بولا' میرا بیٹا بی اے میں پڑھتا ہے۔ اس کا دھیان پڑھائی میں نہیں لگتا۔ ماں ہوتی تو ذرا کھینچ کے رکھتی۔ مائیں ہی پڑھاتی ہیں بچوں کو۔ وہ خود ایک ایئر کریش میں ہلاک ہو گئی تھی بے چاری۔ میری بیٹی بھی اس کے ساتھ تھی۔ پچیس سال ہو گئے اس منحوس واقعے کو' لیکن اس سے میری زندگی میں جو خلا پیدا ہوا وہ کبھی نہیں بھرا۔ وہ اپنی ماں سے ملنے جا رہی تھی۔ میں نے ضد کی کہ بیٹے کو میرے پاس چھوڑ جائے۔ پتہ ہوتا کہ کیا ہونا ہے تو دونوں کو روک لیتا۔ بس ان کی آئی ہوئی تھی۔'' اس نے سرد آہ بھری اور سر جھکا کر خاموشی سے کچھ سوچنے لگا۔ اس کے بال نصف سے زیادہ سفید تھے اور بیچ میں صاف شفاف گول ٹکیہ سی چندیا تھی۔

اسے گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ یہاں سے باہر جانے کا سوچتے ہوئے اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے جیسے سو رہا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب۔'' اس نے پکار کر کہا۔ ڈاکٹر ریاض احمد نے سر اٹھایا اور گہرے گہرے سانس بھرنے لگا۔ ساتھ ساتھ کھانس بھی رہا تھا۔ ایک ہاتھ دل

کے مقام پر چھاتی پر رکھے وہ دوسرے سے اپنا منہ ڈھانپے ہوئے تھا۔ پھر کھانستے ہوئے دہرا ہو گیا۔ وقفے وقفے سے اس کا جسم مرگی کے مریض کی طرح جھٹکے کھاتا۔ ہولے ہولے جیسے آواز اس کے گلے کے اندر ہی کہیں گم ہو گئی تھی۔ وہ کھانستا اور مشقت کے ساتھ سانس اندر کھینچنے کی کوشش کرتا لیکن آواز نہیں نکلتی تھی۔ جیسے موت کے ساتھ یہ جنگ اندر ہی کہیں کسی گمنام جزیرے پر لڑی جا رہی تھی۔

وہ یہ جنگ جیت نہیں سکا۔ ایک زبردست جھٹکے کے نتیجے میں وہ پہلے کچھ اوپر اٹھا اور پھر اس کی گردن اس کے گھٹنوں پر سے سرکتی ہوئی کرسی کی ہتھی سے جا لگی۔ اس کی آنکھیں شدید کرب سے پتھرا کر خلاء میں کسی ایک نقطے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ مر چکا تھا' اسے اس کی نبض دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ حواس باختگی کے ساتھ موڈھے پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے لگا ایک دم سے جیسے اس کے دماغ نے کام کرنا مطلق موقوف کر دیا ہو۔

وہ سرعت سے بھاگتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ راہداری سے ہو کر زینے سے نیچے اترا۔ باہر دروازے کی دہلیز پر اس کا چرمی تھیلا اور چھاتا جوں کا توں پڑا تھا۔ انہیں اٹھا کر تیزی سے دروازہ کھول کر باہر آیا اور بھاگتا ہوا باہر سڑک پر آ گیا۔ بارش تھم چکی تھی۔ سڑک پر ٹریفک پہلے کی نسبت بڑھ گئی تھی۔

قائم آباد میں پندرہ روزہ قیام اس کا بہت مصروفیت میں گزرا۔ اس نے کانفرنس میں اپنا مقالہ پڑھا۔ انتظامیہ کی جانب سے منعقد کی گئی ورکشاپ میں شرکت کی اور ممتاز ماہرین سے ملا۔ اس تمام عرصے میں ایک لمحے کے لیے بھی ان واقعات کی یاد اس کے ذہن سے محو نہیں ہوئی۔

گھر لوٹتے ہوئے اس نے ڈرائیور کو اسی گلی کے سرے پر ٹیکسی روکنے کو کہا جس میں وہ اس بارش والے دن داخل ہوا تھا۔ گھر پہچاننے میں اسے دیر نہ لگی۔

باہری دیوار پر بیل کے بٹن کے برابر ایک سفید چوڑی تختی پر سیاہ جلی حروف میں ڈاکٹر ریاض احمد لکھا تھا۔ پستہ قد چوبی دروازے پر سبز روغن کیا گیا تھا جو اپنی چمک میں تازہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے چھوا جائے تو ہاتھ پر اتر آئے گا۔ برابر ہی ڈیلیا کی بیل تھی' ویسے ہی ستانے کے انداز میں دیوار پر لیٹی اور نیچے لٹکتی ہوئی۔ عقب میں پاپولر کا بلند قامت درخت تھا جو اس منظر میں بہت مانوس معلوم ہو رہا تھا حالانکہ اسے یاد تھا' یہ اسے پہلے دکھائی نہیں دیا تھا۔ سامنے کا منظر ایک تبدیلی کے علاوہ ویسا ہی تھا جیسا اس نے پہلے دیکھا یا ان دنوں میں سوچا تھا۔ صدر دروازے سے رہائشی عمارت تک راستہ پختہ کر کے اس پر سیمنٹ اور بجری کا فرش بچھایا گیا تھا۔

اس نے بیل کا بٹن دبایا۔ کچھ دیر بعد رہائشی عمارت کا دروازہ کھلا اور ایک چھ سات برس کی بچی سرخ اور سفید رنگ کی شرٹ اور سکرٹ پہنے ہوئے برآمد ہوئی۔ کچھ دیر چوکھٹ پر ہی کھڑی باہر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے سے کچھ قدموں کے فاصلے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ بولی "آپ کو کس سے ملنا ہے۔۔۔ انکل؟"

"آپ کے ڈیڈی سے۔ گھر پر ہیں کیا۔"

"ڈیڈی۔ ڈیڈی۔ انکل آئے ہیں۔" وہ شور مچاتے ہوئے واپس بھاگ گئی۔ ایک پینتیس چالیس برس کا چہرے سے نہایت سنجیدہ دکھائی

دینے والا مرد آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگائے رہائشی عمارت سے برآمد ہوا۔ڈاکٹر ریاض احمد کو پہچاننے میں اسے ذرا بھی دیر نہ لگی۔ دروازے کے قریب آ کر ڈاکٹر نے اس سے مصافحہ کیا۔

چند ثانیے اس سے کسی بات کی توقع میں چپ رہنے کے بعد ڈاکٹر بولا ''جی آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

جانے کیوں یکبارگی اسے ہر شے بالکل نارمل معلوم ہوئی' معمول کے مطابق اور سمجھ میں آجانے والی۔''آپ سے ہی ڈاکٹر صاحب۔''

''جی فرمایئے۔آپ لیاقت ایڈووکیٹ تو نہیں ہیں۔''

''جی نہیں۔اصل میں مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

''کیا اس وقت ضروری ہے؟''

''ڈاکٹر صاحب میں ایک لیکچرار ہوں اور ایک اہم معاملے میں آپ سے مشورہ چاہتا ہوں۔''ڈاکٹر نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔اس کی بیٹی اس کی ٹانگوں سے لپٹی غور سے انکل کو دیکھ رہی تھی۔

'اس وقت ممکن نہیں ہے۔میں کچھ مصروف ہوں۔میں اپنی بیوی اور بچی کو ائیرپورٹ چھوڑنے جارہا ہوں۔یہ اپنی نانی کے گھر جارہی ہے۔''ڈاکٹر نے بچی کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے اور بچی کو محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

''اصل میں۔۔۔۔''وہ کچھ کہتا کہتا رک گیا۔ایک لمحے کے لیے اس کا جی چاہا کہ ڈاکٹر کے پیروں میں گر جائے اور معصوم بچی کی زندگی کی بھیک مانگے۔لیکن کیا وہ کسی بھی تبدیلی کی ذمہ داری لے سکے گا؟ اسے لگا جیسے اسے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔

ڈاکٹر کہہ رہا تھا ''اگر آپ شام کو کسی وقت تشریف لائیں تو اطمینان سے گفتگو ممکن ہو سکے گی۔''

اس نے ڈاکٹر سے مصافحہ کیا اور لوٹ آیا۔گیٹ سے نکلتے ہوئے اس نے دیکھا بچی بدستور باپ کی ٹانگوں سے لپٹی اسے دیکھ رہی تھی۔اس کی آنکھوں میں معصومیت سے لبریز مسرت کی چمک تھی اور وہ مسکرا رہی تھی جیسے اس کی بے بسی پر۔

نکڑ

اس دن شام عام دنوں کی نسبت کچھ پہلے ہی آن وارد ہوئی اور محلہ موہلیاں میں گھروں کے دروازوں پر دستک دینے لگی۔ سورج ہانپ کر گہنا چکا تھا اور ہوا میں ایک سمجھ میں نہ آنے والی بے چینی تھی۔ کبھی لگتا یہ پیچ وتاب کھا رہی ہے۔ رک رک کر چلتی اور چلتی چلتی رک جاتی۔ پلٹ پلٹ کر آتی اور چھتوں سے بندھی رسیوں پر لٹکے ہوئے کپڑوں کو پھریروں کی طرح اوپر کچھ اس طرح اڑاتی کہ وہ اچھل اچھل کر پرے بنیروں پہ جا پڑتے۔ فطرت کا اگر دل تھا، تو اس روز وہ بے طرح ڈول رہا تھا۔

لیکن فورمین حبیب کے گھر شام کے بوجھل پن اور اضطراب کا رنگ اور ہی تھا۔ ہوا بھی جیسے بگولوں کی صورت کھڑکیوں اور دراوزوں کی درزوں میں راہ بنا کر اندر گھس آتی اور برتنوں، پٹوں، حتیٰ کہ دیوار سے ٹنگے چار قلوں والے بھاری فریم کو کھڑکھڑاتی۔ ایسا ہی سماں تھا جب فورمین حبیب کے گھر سے درد اور وحشت بھری نسوانی چیخ محلے میں گونجی۔ یہ چیخ عجب غیر انسانی آواز میں ایسے آہنگ سے بلند ہوئی کہ سننے والوں کے بیان کے مطابق کسی انسان کی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ آواز باہر گلی میں دور تک لوگوں کی سماعتوں کو چھو رہی تھی ''چھوڑ دو مجھے۔ پاس مت آنا۔ دور رہو۔ مار دوں گا۔ جلا دوں گا۔ سب کو۔ خبردار جو کوئی یہاں آیا۔ سب کو مار دوں گا۔ سب کو مار دوں گا۔'' لڑکی کی تیز تیز سانسیں یوں چل رہی تھیں جیسے بہت سارے لوگ مل کر ہانپ رہے ہوں۔ ان کی ایسی دھمک تھی کہ سننے والوں کے کلیجے دہل اٹھے۔ خوف سے ان کے پیر جہاں تھے، وہیں جم کر رہ گئے۔ کوئی بھی اپنے گھر سے نکلنے یا اس گھر کی طرف آنے کا حوصلہ نہ کر پایا۔ ''سب کو دیکھ لوں گا۔ مجھے مارتے ہو۔ میں تمہیں مار دوں گا۔ سب کو۔ سب کو۔ سب کو۔۔۔''

اور یوں برسوں پرانی یہ روایت سچ ثابت ہوئی کہ اس گھر کی سیڑھیوں کے نیچے موجود نکڑ میں آسیب تھا جو نوجوان کنواری لڑکیوں کو اپنے تسلط میں کر کے دیوانہ بنا دیتا اور ان کی زندگیاں رول دیتا تھا۔ کوئی اس کی اصل حقیقت سے آگاہ نہیں تھا۔ لوگ کہتے تھے اور چونکہ یہ باتیں برسوں سے زبان زد عام تھیں، اس لیے ضرور سچ ہوں گی کہ جہاں یہ گھر ہے مدتوں پہلے یہاں ایک شمشان گھاٹ تھا۔ خاندانی دشمنی کی بنا پر ایک عورت کو اس کی سہاگ رات کو ہی اپنے دولہا کے ہمراہ ذبح کر دیا گیا۔ اس کی چتا یہاں جلائی گئی تھی۔ تب سے آج تک اس کی روح یہاں بھٹکتی تھی۔ کون جانے کیا سچ تھا۔ لیکن یہ تو سبھی جانتے تھے کہ کتنی ہی لڑکیاں اس آسیب کا شکار ہو چکی تھیں۔ ایک مدت یہ گھر خالی رہا۔ کم سے کم کرائے پر بھی کوئی اس بھوت گھر میں آنے پر آمادہ نہ ہوتا۔ فورمین حبیب ان توہمات کو نہیں مانتا تھا۔ سو کوئی ایک سال پہلے وہ اپنی بیوی اور دو بچیوں کے ساتھ یہاں اٹھ آیا۔

سہیل سے اس کی ملاقات ماسٹر جنرل سٹور پر ہوئی جہاں جاسوسی ڈائجسٹ اور ابنِ صفی کی عمران سیریز سے لے کر منٹو کی 'مرد' تک ہر طرح

کی کتابوں پر مشتمل ایک چھوٹے پیمانے کی لائبریری تھی۔ وہ گلی کے کسی بچے کو بھیج کر، یا کبھی والدہ کے ساتھ بازار جاتے ہوئے اور کبھی پڑوس ہی میں رہنے والی اپنی ایک دوست نسیم کے ساتھ جا کر اپنی پسند کی کتابیں پچاس پیسے یومیہ کے حساب سے کرائے پر لے آتی۔ اس نے جنرل سٹور کے ماسٹر صاحب سے شمسہ کنول کے ناول 'آسمان' کے بارے میں پوچھا تو وہ رجسٹر دیکھنے لگے۔ سہیل جو پاس ہی کھڑا تھا اور شاید کتاب لینے ہی آیا تھا، بظاہر ماسٹر صاحب سے مگر اصل میں اس سے مخاطب ہو کر بولا "یہ میرے پاس ہے"۔ اس نے گردن پھیر کر بس چند ثانیوں کیلئے اسے دیکھا اور پھر نگاہ پرے پھیر لی۔ لیکن اتنی مختصر دید نے ہی سہیل کیلئے اس کے دل میں ایسی لہر سی پیدا کی کہ وہ مسرت کے کسی شدید احساس سے جھنجھنا اٹھی اور اس کے رخسار دہکنے لگے۔

"کب لاؤ گے سہیل"۔ ماسٹر صاحب نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ بولا "کل ماسٹر جی۔"

"نجمہ پتر کل لے جانا۔" ماسٹر صاحب نے ناک کے بانسے پر عینک کو شہادت کی انگلی سے ذرا اوپر کھسکاتے ہوئے بغور لڑکی اور لڑکے کو دیکھا۔

نجمہ نے شمسہ کنول کا ایک دوسرا ناول 'دریا کنارے' لیا اور لوٹ آئی۔ لیکن عجب بات ہوئی کہ ناول کے ہیرو کا نام بھی سہیل تھا، اس میں موجود ہر مرد کردار کا نام سہیل تھا، بلکہ ہر نام سہیل ہی تھا جو اس نے اس روز 'پڑھا' سنا، یا سوچا۔ اگلے روز سہیل 'آسمان' ناول لوٹا گیا تو وہ اسے لے آئی۔ ماسٹر صاحب نے اسے الماری میں نہیں رکھا تھا۔ بلکہ کاؤنٹر کے برابر ہی دھر دیا تھا۔

"سہیل تو صبح ہی آ کے دے گیا تھا۔ وعدے کا بڑا پکا ہے۔ اچھا بچہ ہے۔" ماسٹر صاحب نے رجسٹر میں ناول کا اندراج نجمہ کے نام کے ساتھ کرتے ہوئے کہا۔

یوں لگا ہے بگا ہے وہ اسے بازار میں پھرتے ہوئے، یا ماسٹر جنرل سٹور پر ہی دکھائی دینے لگا۔ وہ اسے دیکھ کر دھیرے سے مسکراتا تو اس کی آنکھوں پر حجاب کی پرچھائیں سی آ جاتی اور وہ جھک جاتیں۔

تمام دن وہ گھر میں بیٹھی ایسے ہی ناول پڑھتی جن میں بیشتر ایسی لڑکیوں کی کہانیاں ہوتیں جو اس کے جیسے گھروں میں پیدا ہونے کے باوجود بہت مختلف قسمت لئے ہوتیں۔ وہ اپنی خوبصورتی کے باعث شہزادے جیسے خوبصورت اور دولت مند کسی نوجوان کو بھا جاتیں جو انہیں تنگ گھروں سے نکال کر اپنی دنیا میں لے جاتا اور انہیں بڑی بڑی کوٹھیوں، قیمتی کاروں، بھاری جوڑوں' غیر ملک کی خوشبوؤں اور میک اپ کے سامان سے سجی ہوئی اعلیٰ سوسائٹی کی بے فکری کی زندگی عطا کرتا۔

اس نے میٹرک اچھے نمبروں کے ساتھ سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ اسے پڑھنے کا شوق تھا لیکن اس کا باپ فورمین حبیب اس کے مزید پڑھنے کے حق میں نہیں تھا۔ "ہم نے بیٹی سے نوکری نہیں کرانی۔ اللہ نے چاہا تو اچھی جگہ اس کی بات پکی ہو جائے گی۔ اپنے گھر جا کر پھر جو چاہے کرے۔ اسے گھر داری سکھاؤ۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں اس کی ماں سے کہا۔

وہ سارے خوبصورت خواب' جو اس نے کالج کی زندگی کے بارے میں دیکھ رکھے تھے، ٹوٹ گئے۔ بہت کچھ اس کے دل میں بھی شکست و ریخت کا شکار ہوا تھا۔ ایک عرصہ وہ اپنے کرچی کرچی خوابوں پر چل کر اپنے تلوے زخمی کرتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ وقت کے مرہم نے ان زخموں کو بھر

دیا۔اس نے اپنے لئے گھر کے کام کاج، اور ماسٹر جنرل سٹور کی لائبریری میں دلچسپیاں ڈھونڈ لیں۔کالج کی زندگی خواب وخیال ہی رہی۔

سہیل نے اس کے من کی دنیا میں پھر سے اجالا کیا تھا۔اس کے دن میٹھی لذتوں، دھیمی دھیمی مسکراہٹوں اور ٹھنڈی آہوں سے بھر گئے۔ ناولوں کے آخر میں استر کے خالی صفحوں پر اسے دوسرے پڑھنے والوں کے ساتھ سہیل کی رائیں بھی لکھی ملتیں۔وہ انہیں پڑھتی اور نہ معلوم کیوں بالکل ٹھیک اسے لگتا کہ یہ باتیں اس کے لیے تھیں۔کہیں لکھا ہوتا ''شبنم کی حیا میں بھیگی ہوئی نگاہیں اس ناول کی جان ہیں۔'' کبھی وہ لکھتا ''صائمہ کسی پھول کی طرح حسین اور نازک لڑکی ہے۔کاش زندگی اس کے ساتھ اتنے ستم نہ کرتی۔آخر پھولوں کے ساتھ کانٹے کیوں ہوتے ہیں۔'' ایک ناول کی ہیروئن اس کی ہم نام تھی۔اس کے بارے میں سہیل نے لکھا۔''نجمہ کے کردار میں بڑی اپنائیت ہے۔لیکن اسے کوئی چاہنے والا نہ ملا۔ کاش نجمہ میری زندگی میں آتی، میں اسے پلکوں پر بٹھا کر رکھتا۔''

یوں وہ نجمہ سے بالواسطہ طور پر مکالمہ کرتا۔لیکن ایک دن یہ مکالمہ براہ راست ہوگیا۔ارم سید کے ناول 'بازگشت' میں سہیل کی رائے جو ایک مختصر پرچی پر الگ سے لکھی تھی' اس کی آنکھوں میں ستارے ٹانک گئی۔''میں جانتا ہوں۔نجمہ آپ یہ ناول پڑھیں گی۔اگر میں یہ ناول لکھتا تو اسے آپ کے نام کرتا۔'' نجمہ نے گہرا سانس بھرا۔وہ اپنا دل اس کے نام کر چکی تھی۔

جب تک کہ فورمین حبیب محبت کے اس پودے کو' جو اس کی بیٹی اور سہیل کے درمیان خاموشی سے پنپ رہا تھا، جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کیلئے آگے بڑھتا، نوبت کتاب کے صفحات میں پوشیدہ محبت کی پھواروں میں رنگے ہوئے چھوٹے چھوٹے رقعوں سے بڑھ کر نہایت مختصر، عام مگر ان کے لیے پراثر مکالموں تک جا پہنچی تھی جو اکثر وہیں ماسٹر جنرل سٹور پر ہوتے۔وسیم ہر روز پہروں سٹور کے ایک طرف کھڑا ہو کر اس کا انتظار کھینچتا۔سہیل اس سے ناول کے بارے میں پوچھتا۔وہ کچھ ایسا جواب دے کر کہ ''اچھا ہے۔'' حجاب سے بوجھل نظریں جھکا لیتی۔جو کتاب سہیل لوٹاتا' وہ اسے فوراً اپنے نام جاری کرا لیتی۔کتاب ماسٹر صاحب کے ہاتھ میں جانے سے پہلے نجمہ تک پہنچ جاتی اور اس کے ساتھ ہی سہیل کا لکھا ہوا رقعہ بھی۔بس ایسا ہی ایک رقعہ تھا جو فورمین حبیب نے اس کتاب میں دیکھ لیا جو نجمہ پڑھنے کیلئے لائی تھی۔

صرف اس کا ماسٹر جنرل سٹور جانا اور وہاں سے کتابیں لانا ہی بند نہ ہوا، کہیں بھی آنے جانے کی ممانعت ہوگئی۔فورمین حبیب تو ہاتھ اٹھا کر بیٹی کی طرف لپکا تھا۔بیوی راہ میں آ کر اس کے پیر نہ پکڑ لیتی اور اس کے حصے کی مار خود نہ کھا لیتی تو وہ اسے پیٹ ہی ڈالتا۔

''خبردار جو اس حرامزادی نے گھر سے باہر پیر رکھا تو۔'' اس نے پہلی بار بیٹی کو گالی دی' ایسی ننگی گالی کہ ایک مدت اس کی روح میں گونجتی رہی۔وہ میٹرک سے آگے نہ پڑھ سکی تھی۔یہ زخم ہی ابھی بھرا نہ تھا کہ یہ ایک اور چھٹ اس کی روح کو گھائل کر گیا۔لیکن وہ پھر بھی پُرامید تھی۔سہیل نے اپنے آخری رقعے میں لکھا تھا کہ وہ اپنی ماں کو اس کے گھر بھیجنا چاہتا ہے، اس کا رشتہ مانگنے کیلئے۔کئی ہفتے بعد اس کی ماں آئی بھی' لیکن۔۔۔ ''ملکوں اور سیدوں کا کیا میل؟'' اس کے باپ نے درشت لہجے میں اس رشتے سے صاف انکار کر دیا۔''کیا ہوا جو وہ مالدار ہیں۔ہوں گے اپنے گھر میں۔ ہماری برادری والے مر گئے ہیں کیا۔لوگوں کو پتہ چلے گا کہ سیدوں کی لڑکی ملکوں کے گھر گئی ہے تو تھو تھو نہ ہوگی۔لوگ ہزار باتیں کریں گے۔''

اس شام کو حبیب فیکٹری سے لوٹا تو بیوی نے خاوند کو سمجھانے کی کوشش کی کہ بیٹی نے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ سہیل سے محبت کرتی ہے۔ شادی کرے گی تو اسی سے، ورنہ زہر کھا کر جان دے دے گی۔

''یہ تیری بیٹی''۔ بیوی بس اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ فورمین بولا ''کیا بیٹی۔'' اس کا خون کھول اٹھا۔ وہ دیوانہ وار اپنی جگہ سے اٹھا اور اندر کمرے میں گیا جہاں بیٹی دروازے سے لگی چھپ کر ماں باپ کی گفتگو پر کان لگائے ہوئے تھی۔ باپ بیٹی نے بہت غور سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک ایسا زوردار تھپڑ باپ نے بیٹی کے منہ پر مارا کہ وہ چکرا کر چند قدم پرے جا گری۔ تھپڑ کا سرخ نشان بہت دنوں بعد کہیں لڑکی کے گال پر سے صاف ہوا لیکن اندر کا داغ، جو اس تھپڑ نے اس کی روح پر لگایا تھا، مندمل نہ ہو سکا، چنگاری کی طرح سلگتا رہا اور اس کے اندر ہر شے کو جلاتا رہا، اس کے ہوش و حواس کی تنکوں سے بنی دنیا کو بھی۔

فورمین حبیب نے عجلت میں اپنے کارخانے ہی میں برادری کا ایک لڑکا تلاش کیا جو موٹر مکینک تھا۔ تنخواہ اس کی واجبی سی تھی لیکن لڑکا شریف تھا۔ گو صرف پرائمری پاس تھا لیکن اس کی بیٹی کون سی ماسٹرنی تھی۔ لڑکے کے ماں باپ اور چند دوسرے رشتہ دار فورمین حبیب کے گھر آئے اور لڑکی کو دیکھ کر پسند کر گئے۔ چھوٹی سی تقریب کچھ دنوں بعد ہوئی اور وہ لڑکی کو سونے کی انگوٹھی پہنا گئے۔ شادی کیلئے ڈیڑھ ماہ بعد کی تاریخ طے ہوئی جب سال ختم ہوئے دو ہفتے گزر چکے ہوں گے اور لڑکے کی تنخواہ میں کارخانے کے اصول کے مطابق دو تین سو روپے اضافہ ہو چکا ہوگا۔ سب کچھ چٹ پٹ ہوا۔ شاید فورمین حبیب بیٹی کے کچلے ہوئے وجود میں کہیں سرکشی کی رمق پا گیا تھا۔ صورت حال مزید سنگین ہو، لڑکی کوئی اور چاند چڑھائے، وہ اسے جلد سے جلد گھر سے وداع کر کے فارغ ہو جانا چاہتا تھا۔ لڑکی کی کوئی ایسی ویسی حرکت اس کی چھوٹی بہن کے ذہن کو بھی گمراہ کر سکتی تھی جو ابھی چوتھی جماعت میں تھی۔ فورمین حبیب کا بس چلتا تو منگنی کا تکلف بھی گوارہ نہ کرتا۔ سیدھا نکاح کر دیتا۔ لڑکی چاہے ڈیڑھ دو ماہ بعد رخصت ہوتی۔ لیکن لڑکے والوں کو کوئی عجلت نہیں تھی اور نہ ہی وہ ان پر اپنا راز آشکار کرنا چاہتا تھا۔

لیکن نجمہ کے اطوار میں عجیب طرح کا ٹیڑھا پن آ ہی گیا جس میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ترقی ہوئی۔ راتوں کو وہ سخت سردی میں کمرے سے نکلتی اور باہر چھجے میں کھڑی ہو جاتی یا نیچے ڈیوڑھی میں سیڑھیوں کے پاس جا کر بیٹھ جاتی جہاں واشنگ مشین پڑی تھی اور پاس ہی موری میں کاکروچوں کا مسکن تھا جو تمام رات ہر طرف رینگتے پھرتے۔ وہ تو اس کی چھوٹی بہن جا کر ماں کو خبر کرتی اور دونوں میاں بیوی اسے تلاش کرتے۔ کبھی اچانک وہ بیٹھے بیٹھے اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتی، کچھ ایسی زبان میں جو اس کی ماں اور بہن کو خاک بھی سمجھ میں نہ آتی۔ مگر انہیں خوف میں مبتلا کرتی۔ خوف کے ساتھ ماں باپ کو کبھی کبھی رحم بھی آتا کہ جوان لڑکی کی حالت روز بروز زبوں تر ہو رہی تھی۔ اس بیچاری کا آخر قصور ہی کیا تھا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی؟ ایک دن اس نے چھوٹی بہن کی کاپی کے سارے صفحے سیاہ کر دیئے، سہیل کا نام لکھ لکھ کر۔ دیواروں پر وہ اس کا نام لکھتی، مٹاتی اور پھر روتی۔ ماں اور بہن کا کلیجہ اس کی حالت دیکھ دیکھ کر کٹتا۔ لیکن وہ اس کیلئے کر بھی کیا سکتی تھیں۔

ایک دن جب اس کی ماں اندر کمرے میں بڑا ٹرنک کھولے اس کے جہیز کے جوڑے نکال کر ٹھیک کر رہی تھی کہ نجمہ چادر اوڑھے پیر پٹختی

ہوئی اپنے کمرے سے نکلی اور کسی سے کچھ کہے بغیر خاموشی سے گھر سے باہر چلی گئی۔ ماں کو پتہ چلا تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ جلدی سے برقع پہن کر ایک ایک کر کے پڑوس کے سبھی گھروں میں جھانکا۔ کوئی پوچھے کہ کیا ڈھونڈ رہی ہو تو اس سے کچھ کہے بھی نہ بنتی۔ کہے بھی تو کیا؟ کیسے بتائے کہ جوان لڑکی گھر سے بھاگ گئی؟ اس کی جن جن سہیلیوں کے گھروں کا پتہ اسے معلوم تھا' وہاں ہو آئی۔ سہ پہر ہو چکی تھی جب تھکی ماندی لوٹی تو دیکھا نجمہ اپنے کمرے میں تھی۔ چھوٹی لڑکی نے بتایا کہ ابھی ابھی لوٹی ہے۔

ماں نے نجمہ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن خاوند کو اس خوف سے سارا احوال سنا دیا کہ کل کلاں کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو وہ اس پر الزام نہ دھرے کہ اس نے بیٹی کی حالت سے اسے انجان رکھا۔ اسے کچھ امید سی تھی کہ شاید باپ کو اس پر رحم آجائے اور وہ یہ کہے کہ بیٹی کی خوشی سے بڑھ کر اسے کیا شے عزیز ہو سکتی ہے۔ لیکن وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

فورمین حبیب اٹھا اور بیٹی کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر صحن میں لے آیا۔ شام ڈھل چکی تھی۔ دن کا چراغ بجھ رہا تھا۔ سورج کی لو اتنی مدھم ہو گئی تھی کہ گھروں میں بلب جلا دیئے گئے تھے۔ لڑکی بے جان لاش کی طرح باپ کے ساتھ گھسٹتی چلی آئی' کسی بھی طرح کی مزاحمت کئے بغیر' خاموشی سے' چہرہ پرے موڑے جیسے باپ کی صورت دیکھنے سے محترز ہو۔ اس نے بیٹی کو آنگن میں دھکیل دیا' پھر بالوں سے اٹھا کر سامنے کھڑا کیا اور غرایا "میں تیری ہڈیاں توڑ دوں گا۔ گلا گھونٹ دوں گا۔ عشق کا بھوت تیرے سر سے اتر جائے گا۔ اگر کبھی اس لوفر کا نام تیری زبان پر آیا' یا اسے تو نے کبھی کچھ لکھا تو تیرا گلا کاٹ کر یہیں دفن کر دوں گا۔ تو سسرال میں ہماری ناک کٹوائے گی۔ برادری میں عزت خاک میں ملائے گی۔ بول باز آئے گی کہ نہیں۔ بول۔ تو باز آئے گی کہ نہیں۔ کیا چاہتی ہے تو؟ یہ لے۔" یہ کہتے ہوئے فورمین نے اسے اپنی طرف کھینچا اور اس کی گدی پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔ جواب میں لڑکی نے منہ سے سی بھی نہ کی۔ سرخ آنکھوں کے ساتھ جن میں آنسو نہیں تھے' حیرت' خوف' دکھ درد' ایسا کچھ بھی نہ تھا' وہ باپ کو دیکھتی رہی۔ بس سرخی تھی۔ لیکن اس سرخی کے عقب میں غور سے دیکھو تو سب کچھ تھا' اور سب سے نمایاں تھی دیوانگی۔ دیوانگی جس کی آگ میں وہ سلگ رہی تھی۔

اس نے اچانک دوسرے ہاتھ سے باپ کو پرے دھکا دیا۔ باپ اس غیر متوقع ردعمل پر اپنا توازن کھو بیٹھا اور دو قدم پیچھے آرہا۔ پھر جیسے ہوا کے دوش پر' اس کی ماں نے تو صاف دیکھا کہ وہ چل نہیں رہی تھا' بالکل ساکت تھی' مگر بہت تیزی سے پرے ہٹ رہی تھی۔ وہ قسمیں کھا کر بتاتی تھی کہ وہ ہوا کے جھونکے کی طرح تیزی سے دور ہٹتی ہوئی' سیڑھیوں کے نیچے بنی نکڑ کی طرف بے ساختہ کھنچتی جارہی تھی۔ اس پراسرار نکڑ کی طرف' جہاں آج جمعرات کے دن واہموں کی ماری عورت نے دافع بلیات اور ماورائی ابتلاؤں سے اپنے خاندان کو بچانے کیلئے دو موم بتیاں روشن کی تھیں جن کی لویں دسمبر کی یخ رات میں تیز ہوا کے سبب بے تابی سے پھڑپھڑا رہی تھیں۔

سایہ کہانی

اس رات ایک اور واقعہ بھی ہوا تھا جسے شاید اس کی ماں کبھی نہ جان پائے کہ کمرے میں بھرے دیئے کے دھویں کے اثر سے بستر پر پڑا اس کا جسم تحلیل ہوا اور دھواں بن کر سارے میں پھیل گیا۔ اگلے روز دن چڑھے اس کی ماں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو وہی سایہ جو اپنے برسوں کے معمول کے مطابق رات بھر اس کے سرہانے کھڑا رہا اور خاموشی سے ہونے والے اس واقعے کا واحد عینی شاہد بھی تھا، اور آج حیرت انگیز طور پر دن کا اجالا پھیلنے کے باوجود غائب نہیں ہوا تھا، آگے بڑھا اور چٹخنی کھینچ کر نیچے گرائی۔ اس کی آنکھوں میں برسوں کی شب بیداری کی سرخی تھی اور بال یوں الجھے ہوئے تھے جیسے کوئی پریشان خواب ہو۔ اس نے دروازہ کھولا اور قدرے برہمی سے اس کی ماں سے بولا ''آتا ہوں، ابھی تو دن چڑھا ہے۔'' ماں جانتی تھی بیٹا دوپہر تک بغیر کھائے پیے سوتا رہے گا۔ وہ اصرار کرنے لگی تو سایہ اس کے بیٹے کیلئے شدید نفرت محسوس کرتے ہوئے طیش بھری آواز میں بولا'' کھانا ابھی آتا ہوں۔ مجھے کیا ویسا ہی سمجھا ہوا ہے۔ ویسا ہی اُس جیسا۔''

اسے یاد تھا اس کے سکول کے ایک دوست رحیمے کی دادی سے وہ سارے بچے بہت ڈرتے تھے، خود رحیما بھی۔ وہ بالکل ایک سایے کی مانند دکھائی دیتی۔ بیٹھی ہوئی ہو یا کھڑی ہو، وہ دیوار پر بنے کسی نقش کی مانند ساکت اور بے روح معلوم ہوتی' اور اگر چل رہی ہو تو ایسا غیر معمولی لطیف وجود معلوم ہوتی جو ہوا سے ہلکا ہو، بالکل ایک سایے کی مانند۔ اسے بولتے چالتے بھی کسی نے نہیں سنا تھا۔ نہ وہ ہنستی تھی نہ روتی تھی۔ اس کا جھریوں بھرا چہرہ پتھر سا معلوم ہوتا۔

وہ کونڈوں والا دن اسے کبھی نہیں بھولا۔

رحیما اُچی گلی میں مائی لاڈو کی مسجد کے سامنے گھر میں رہتا تھا۔ وہ اس کے ہاں کونڈے کھانے گیا تھا۔ لوگ فجر کی نماز پڑھ کر مسجدوں سے لوٹے نہ ہوں گے کہ اس نے جا کر گھر کی کنڈی کھڑکائی۔ ہر سال اس رات رحیمے کا باپ گھر کے صحن میں بڑے پتیلوں میں حلوہ اور چنے پکاتا۔ نماز کے بعد پوریاں تلی جاتیں۔ ابھی گھی کڑاہے میں گرم ہو رہا تھا۔ اس کی دستک سے ہلکا سا دباؤ پڑا تو دروازے کا ایک پٹ اندر کھسک گیا۔ جبھی اسے سامنے رحیمے کی دادی کھڑی دکھائی دی۔ بے جان آنکھوں، جن میں سدا کی چپ بھری تھی، سے وہ اس کی جانب دیکھ رہی تھی اور یوں ساکت تھی جیسے دم سادھے ہو۔ وہ اس کے پرے ہٹنے کا انتظار کرتا رہا۔ وہ چاہتا تو دائیں بائیں ہو کر نکل سکتا تھا لیکن اس کے پیر جیسے مٹی نے جکڑ لیے تھے۔ وہ یوں جامد ہو گیا جیسے کسی نے اسے وہاں گاڑ دیا ہو۔ اس منظر کی دہشت نے اس کے اعصاب کو شل کر دیا اور دیر تک اس میں انہیں ہلانے جلانے کی بھی سکت باقی نہ رہی۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے حواس مجتمع کئے اور الٹے قدموں وہاں سے بھاگ آیا۔ پھر کبھی وہاں نہ جانے کے لیے۔ حتیٰ کہ دادی کے فوت ہونے کے بعد بھی اس نے ادھر کا رخ نہ کیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رحیمے کی دادی کا چہرہ اس کی یادداشت کے آئینے میں دھندلا گیا بس ایک سایہ سا باقی رہ گیا۔ خاموش، ساکت اور بے جان۔ اس دھندلے ہیولے کو مجسم کیا اس کے باپ نے جس کے ساتھ وہ بہت کم وقت ہی گزار پایا۔

اس کا باپ ایک بنک میں درجہ دوم کا افسر تھا۔ واجبی سی تنخواہ پاتا جس سے اس کے تین بھائیوں، بہن، ماں، دادا اور دادی پر مشتمل خاندان جیسے تیسے گزارہ کرتا۔ پینتالیس پچاس کے پیٹے میں تھا جب ایک روز شام کو موٹر سائیکل پر گھر لوٹتے ہوئے ویگن نے اسے ٹکر ماری۔ وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی جان بحق ہو گیا۔ اپنے باپ سے وہ بہت ڈرتا تھا۔ ماں اس سے کہتی کہ شام کو اس کا باپ آئے گا تو وہ اس کی شکایت کرے گی۔ وہ ڈر کے مارے ماں کی ہر بات مان لیتا۔ سکول کا کام ہمیشہ باپ کے گھر آنے سے پہلے مکمل کر لیتا۔ شام کو پہلوانوں کے میدان سے وقت پر جا کر دودھ بھی لے آتا۔ ٹیوشن سے بھی ناغہ نہ کرتا۔ لیکن پھر بھی ماں کو کوئی نہ کوئی ایسی بات مل ہی جاتی کہ وہ اس کے باپ سے شکایت کرتی۔ وہ غصے میں آتا تو کوئی لحاظ نہ کرتا۔ باپ کی دیکھا دیکھی بڑے بھائی بھی بات بے بات اسے پیٹ ڈالتے۔

لیکن باپ کے مرنے کے بعد سب کچھ بہت تیزی سے بدل گیا۔ جیسے اچانک سٹیج پر پردہ گراتے یا اٹھانے سے پرانا منظر نظروں سے اوجھل ہو گیا اور نیا منظر سامنے آ جاتا ہے۔

کچھ پنشن ہر ماہ ماں کو ملتی۔ کچھ وہ سینا پرونا وغیرہ کر کے یافت کر لیتی۔ دونوں بڑے بھائی ٹیلرنگ کے کام پر لگ گئے اور تھوڑے عرصے بعد جب سلائی کرنا سیکھ گئے تو انہیں مہینے کے مہینے جیب خرچ کے نام پر کچھ رقم ملنے لگی۔ یہ سب کچھ مل ملا کر اتنا ہو جاتا کہ گھر کی گاڑی چلتی رہتی۔

سبھی زندہ رہنے کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ وہ ابھی بہت چھوٹا تھا۔ اسے بڑوں نے اس جنگ سے مبرا کر دیا تھا۔ لیکن شاید یہیں کوئی خرابی پیدا ہوئی تھی اور وہ ان کی زندگیوں کے دائرے سے باہر ہو گیا۔ چیزیں بہت تیزی سے اور بالکل غیر متوقع انداز میں بدلی تھیں۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ اس کی روز روز کی ڈانٹ پھٹکار سے تو بچا لیکن اس کے بغیر ایک اور طرح کے عدم تحفظ کا شکار ہو گیا۔ وہ باپ کی مار سے ڈرتا تھا لیکن اگر وہ دفتر سے لوٹنے میں دیر کرتا تو بے چین بھی ہو جاتا۔ وہ موڈ اچھا ہونے پر اسے گھمانے لے جاتا۔ بازار سے اسے کریم والے بسکٹ لے کر دیتا اور اس کے ساتھ 'یسو پنجو ہار کبوتر' بھی کھیلتا۔

اپنے باپ کی موت کے بعد کسمپرسی اور اداسی کے طویل برسوں میں جب ہمیشہ مسکراتے دکھائی دینے والے بہت سے چہرے یا تو منظر پر ہی باقی نہ رہے یا ویسے نہ رہے جیسے پہلے تھے، اور جب اس کی ماں نے ہمیشہ کے لیے اپنے چہرے پر بیوگی کی کرختگی اور جھریاں اوڑھ لی تھیں، تو چہروں پر سے اس کا اعتبار اٹھ گیا۔ چہرے جو بظاہر جیسے بھی ہوں، ہوتے ایک جیسے ہیں، انجان، بے حس اور چھوڑ جانے والے۔

رات کو وہ کمرے کی بتی بجھا کر بستر میں لیٹتا، گہری تاریکی ہر سو اپنے تنبو تان لیتی، روشنی میں دکھائی دینے والی چیزیں اس کی اوٹ میں ہو جاتیں، اور وہ کچھ دکھائی دینے لگتا جو روشنی میں نہیں دکھتا ہے تو یہ سایہ ابھرتا۔ کمرے کے داہنی گوشے میں، لکھنے کی میز اور کرسی کے برابر دیوار پر ٹنگے کیلنڈر کے نیچے بنے کسی نقش کی مانند۔

وہ لیٹا پلک جھپکائے بنا اس کی اور تکتا، اور ایسے میں کسی لمحے نیند اس کی آنکھوں کے پیالوں میں اترتی، شراب طہور کی مانند۔ روز ایسا ہی

ہوتا۔ اور یوں سایہ اور اس کی نیند ایک دوسرے سے مشروط ہو گئے۔

اس کی ماں بتاتی تھی اس گھر میں ایک سے زیادہ نکڑیں بھاری تھیں۔ بچپن میں وہ اپنی دادی کو جمعرات کے جمعرات گھر میں دو نکڑوں میں دیئے جلاتے دیکھتا۔ وہ دیوں میں تیل بھرتی' روئی مروڑ کر بتی بناتی' اسے اچھی طرح تیل میں بھگوتی اور سلگاتی۔ پھر ہاتھ اٹھا کر وہیں بیٹھ جاتی اور بڑبڑاتے ہوئے دعا مانگتی کہ اس نکڑ میں رہنے والی ارواح اس کی آل اولاد کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ ہوا سے دیئے کی لو کپکپاتی تو دادی کا سایہ دیوار پر طرح طرح کی شکلیں بناتا۔ کبھی یہ سایہ پر پھیلا کر جھپٹنے والی دیوہیکل چیل کی شبیہہ بناتا' کبھی غراتے ہوئے کتے کی' اور کبھی غصے میں چیختے اور ہاتھ اٹھا کر اسے مارنے کو دوڑتے اس کے باپ کی۔ یہ شبیہیں اسے خوابوں میں ڈراتی تھیں۔ وہ روتا ہوا اٹھ بیٹھتا۔ ماں آیۃ الکرسی پڑھ کر اس پر پھونکیں مارتی اور اسے تھپڑا دیتی۔ ہمیشہ اسے لگتا کہ خوف نکڑوں میں رہنے والی روحوں کی طرح کوئی جاندار شے تھا جو ماں کے اس عمل سے دم دبا کر بھاگ جاتا۔ وہ روتے روتے چپ ہو جاتا اور سو جاتا۔ ماں کی آیۃ الکرسی پڑھنے کی بڑبڑاہٹ اور پیار بھرا تھپڑا' ایک گہرے احساس کی مانند اس کے خوف کے زخموں پر مرہم کا کام کرتا۔

دادی پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئیں تو انہوں نے بہو کو حکم دیا کہ اس معمول میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ تب سے وہ ماں کو دیا جلاتے دیکھ رہا تھا۔ تقدس بھرے احترام اور اپنی ساس سے بڑھ کر باقاعدگی کے ساتھ۔ کبھی اسے اس پراسرار اور دلچسپ کارروائی میں ماں کے ساتھ شریک ہونے کی خواہش محسوس نہ ہوئی۔ گو اس عمل کو ہوتے ہوئے دیکھنا اسے ہمیشہ مرغوب رہا۔ اسے دیئے کے دھویں سے کھانسی اٹھتی اور اس کے دھویں اور دیوار پر کریہہ شبیہیں بناتے اس کی لو کے سایے سے گھن آتی تھی۔ اس نے ماں کو کبھی اس سائے کے بارے میں نہیں بتایا تو اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھی کہ وہ ڈرتا تھا ماں اس کے کمرے میں بھی دیا جلانا شروع کر دے گی۔ اور پھر وہ رات بھر کھانستا رہے گا' سو نہیں سکے گا۔

اسے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں تھا لیکن شاید میٹرک کے امتحانات کے بعد میسر آنے والے فراغت کے چند مہینوں میں ایسا ہوا تھا کہ وہ سایے سے مخاطب ہوا' تب سایہ محض ایک بے جان شے محض دیوار پر بنا نقش نہیں تھا' ایک جیتا جاگتا وجود تھا جو سانس لیتا' حرکت کر اور سن سکتا تھا۔ وہ اس کی بات سننے کے لیے بے آہٹ چلتا ہوا اس کی چارپائی کی پائنتی آن کھڑا ہوتا۔ وہ پہروں اس سے روبینہ کے بارے میں باتیں کرتا۔ روبینہ' جس کا سوچ کر اس کے دل میں محبت کی سحر آسا گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں۔ یہ اس کا عنفوان شباب تھا۔

وہ اس کی دور پار کی رشتہ دار تھی۔ ایک رشتہ دار کی شادی میں اسے دیکھا۔ ایک بار دیکھا تو پھر کچھ اور نہیں دیکھ پایا وہاں۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ڈھولکی کی تھاپ پر ناچ رہی تھی۔ کبھی وہ سب اکٹھی ناچنے لگتیں' کبھی ایک ایک کر کے۔ اسے بانہیں لہراتے' پیروں پر چکر کھاتے دیکھ کر اس کے حواس کی بتی گل ہوئی تھی۔ اسے یاد نہیں رہا کب تک ناچ کا عمل جاری رہا۔ کب کون لڑکی آئی۔ کب وہ سب ناچیں۔ اسے تو بس وہی دکھائی دیتی رہی۔ خود کو پنجوں کے بل کھڑا کیے' جسم کو ایک لے پر چکر دیتے ہوئے۔

اس کے بعد کے بہت سے برسوں میں جب تک کہ وہ بی اے کر کے نوکری نہ لگ گیا اور عملی زندگی کی مصروفیات نے اس کے ذہن میں پچھلی تمام یادوں پر دھند کا سایہ نہ کر دیا' وہ اس سے ملنے کی شدید خواہش کی آگ میں جلتا اور راتوں کو اٹھ کر آہیں بھرتا رہا۔ وہ کمرے کی تاریکی

میں بے خواب آنکھیں کھولے سپنے بنتا اور سایے سے دل زار زار کی کیفیات بیان کرتا نہ تھکتا۔ لیکن اس لڑکی سے پھر کبھی نہ مل پایا۔

بی اے کے بعد اس نے ایک ٹریڈنگ کمپنی میں اسسٹنٹ ڈسپیچنگ آفیسر کے طور پر نوکری کر لی۔

سارا دن دفتر میں رہتا اور شام کو دوستوں کے ساتھ۔ رات کو تھکا ہارا گھر لوٹتا۔ کھانا کھا کر دیر تک ٹی وی دیکھتا۔ پھر اپنے کمرے میں جا کر سو جاتا۔ بتی بجھاتا تو یہ سایہ اسے اپنی مخصوص جگہ پر دکھائی دیتا۔ اتنے سال ایک حیرت ہوتی کہ کبھی وہ اس سے ڈراک کا تھا۔ یہ حیرت جلد ہی نفرت میں بدل گئی۔ جانے کیوں۔ اسے اس سے کراہت محسوس ہوتی۔ وہ اگلے دن کی دفتری مصروفیات اور شام کو دوستوں کی محفل کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے وجود سے غافل ہو جاتا۔ تب اس کی آنکھوں کے پیالے نیند کے آب سے بھرنے لگتے اور وہ سو جاتا۔ اس معمول کے ساتھ' جو اسے راس آیا تھا' اس نے کئی سال خاموشی سے بتا دیئے کہ ایک روز ثمینہ اس کی زندگی میں آئی۔

وہ اسی کے ڈیپارٹمنٹ میں آئی تھی' کمپیوٹر آپریٹر کے طور پر۔ اس سے پہلے وہ تھی تو اسی ادارے میں' لیکن ڈیپارٹمنٹ مختلف تھا۔ وہ اسے اسسٹ کرتی۔ وہ اس سے پوچھتی کہ فلاں انٹری کو کہاں ڈالنا ہے' تو وہ کہتا میرے دل میں۔ شروع میں تو وہ یہ سب کچھ شاید نہ سن پائی لیکن پھر ہر بات اسے صاف سنائی دینے لگی' اور وہ دونوں ایسے چینل سے جا ہے باآواز بلند ہی سہی' باتیں کرنے لگے کہ جنہیں کوئی دوسرا' چاہے وہ ان کے کتنے ہی قریب بیٹھا ہو' نہ سن پاتا۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے خوشگوار اور میٹھی یادوں سے لبریز دور تھا۔ وہ مسکراتی تو اسے لگتا اس مسکراہٹ میں سارے فسوں پنہاں ہیں۔ فطرت اگر ایک ساز ہے تو یہ مسکراہٹ ایک مضراب تھی جس نے اس کے تاروں میں سروں کی بازگشت پیدا کی۔ یہ بازگشت ایسی بلند آہنگ تھی کہ اس شور میں وہ بہت سی ایسی باتیں یکسر نہیں سن پایا جو وہ لڑکی گاہے بگاہے اپنی غربت' اپنے ریٹائرڈ باپ' بوڑھی ماں اور بیوہ بہن کے بارے میں اسے بتانے کی کوشش کرتی تھی۔ سو اسے پتہ ہی نہ چل سکا کہ اس معاملے کے شروع ہونے کے کوئی سال بھر بعد ثمینہ ایک ایسے شخص سے بیاہی گئی جس کے بڑے بھائی سے اس کی بیوہ بہن کی شادی اسی شرط پر ہوئی تھی کہ دونوں بہنیں ایک ساتھ اس گھر میں آئیں گی۔

وہ تو اپنے تعلق کی خوشگوار یادوں کے ساتھ بیاہ کر چلی گئی لیکن اسے ایک اندھے خلا میں معلق چھوڑ گئی۔ اندھا اور گہرا خلا جس میں بس وہ تھا' اور یہ سایہ۔ یہ اس کا واحد باوفا مگر ناپسندیدہ رفیق تھا جس نے ہمیشہ اس کا ساتھ نبھایا۔ لیکن کبھی جس کا ساتھ وہ گوارا نہ کر سکا۔ اس نے سونے سے پہلے کمرے کی بتی بجھانے کی بچپن کی عادت ترک کر دی تا کہ اس سے مڈبھیڑ نہ ہو سکے تو سایے نے کمرے سے باہر پھیلی تاریکیوں میں اپنے لیے جگہ بنائی اور یوں پہلی بار وہ محض اس کے کمرے تک محدود نہ رہا۔

یونہی سڑک کا موڑ مڑتے ہوئے' کسی درخت کے قریب سے گزرتے ہوئے' یا کچھ دیر آنکھیں میچے بیٹھے رہنے کے بعد اچانک کھولنے پر وہ اسے وہاں تاریکی میں کھڑا دکھائی دیتا۔ چپ چاپ' ساکت اور بے روح۔ وہ جھنجھلا اٹھتا۔

وہ دفتر سے چھٹی کر کے سڑکوں' گلیوں اور پارکوں میں گھومتا رہتا۔ لیکن سایے کی نظروں سے بچ نکلنے کا مکمل احساس اسے لائبریری میں آ کر ہی ہوتا۔ یہ رات آٹھ بجے تک کھلی رہتی۔ وہ سب سے آخر میں وہاں سے نکلتا۔ آٹھ بجنے میں دو ایک منٹ پہلے ہی لائبریری کے ملازمین کمروں کی بتیاں بجھانا شروع کر دیتے۔ یہ عمل چونکہ اس بات کا اشارہ ہوتا کہ اب اسے پھر سے باہر جانا ہوگا' وہ جھنجھلا جاتا۔ ریڈنگ روم کی بتیاں آخر میں گل

کی جاتیں۔ وہ تیزی سے کتاب کے صفحات پڑھتا۔ چاہے کچھ بھی سمجھ میں نہ آئے' لیکن یہ ان لوگوں کے خلاف جو اسے یہاں سے اٹھانے کے درپے تھے' اور تیزی سے اس کی اور بڑھ رہے تھے' ایک احتجاج تھا۔ عجلت میں سطروں پر نظر پھیرتا ہوا' وہ لفظوں کے مطالب سمجھنے کی کوشش کرتا' جس سے اس کا دماغ ہانپ جاتا اور کسی چوٹ کھائے ہوئے باکسر کی طرح ڈھتا جاتا۔

آخر بتیاں گل کرنے والا ریڈنگ ہال میں آتا تو وہ کتنے ہی صفحے اور بعض اوقات کتابوں کی کتابیں چاٹ چکا ہوتا۔ لیکن ایک لفظ بھی یاد نہ رہتا کہ کیا پڑھا تھا۔ کیوں وہ سب کچھ اسے بھول جاتا تھا؟ کون تھا جو اس کے حصے کا پڑھا ہوا خود سمجھ لیتا اور اسے اس سمجھ سے محروم رکھتا تھا؟ بوتا یہ لگاتا اور اس کا پھل وہ کھا جاتا تھا۔ کون تھا وہ؟ اور تب اس کا دھیان سایے کی طرف جاتا۔ نفرت کی جوالا مکھی اس کے دل میں بھڑکتی اور اس کا جی چاہتا' وہ اسے نوچ ڈالے' نیست و نابود کر ڈالے۔ وہ پیچ و تاب کھاتا اور اس میں زیاں اور بے مائگی کا احساس سوا ہو جاتا۔

سو یوں ہوا کہ دفتر جانا رفتہ رفتہ اس نے موقوف کر دیا۔

گھر سے دفتر کے لیے نکلتا تو اپنے قدموں کو کچہری کا موڑ مڑتے ہی یونیورسٹی روڈ کی طرف ہو لینے سے نہ روک پاتا جدھر پبلک لائبریری تھی۔ کبھی کبھار سارا دن کتابیں پڑھنے اور پھر آخر میں یہ احساس دل میں جاگزیں پانے کے بعد' کہ وہ کچھ بھی نہ پڑھ پایا تھا' وہ شدید غصے اور مایوسی کے ساتھ اپنے آپ کو نوچتا اور کاٹتا۔ ''یہ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتا؟'' وہ بے خواب آنکھوں سے اندھیرے میں اسے گھورتے ہوئے بستر پر کروٹیں بدلتا۔ نینداس سے روٹھ جاتی۔ تمام رات دل میں نفرت اور غصے کی گھسن گھیریاں چلتیں۔

جانے ہمیشہ سے بند ہونٹوں کا یہ قفل کھلے تو کیا ہو؟ اس بند در کے عقب میں کیا تھا' کسے معلوم؟ اس نامعلوم کو جاننے کی خواہش میں اس نے کتنی ہی باران بند پٹوں سے اپنا سر پٹخا۔ لیکن بے سود۔ ''تم کون ہو۔ کیا ہو۔ سنتے ہو پر بولتے کچھ نہیں۔'' جانے کیسے کیسے سوالوں کے سانپ اس کے دماغ سے لپٹے پھنکارتے۔ ''تم مجھے آزاد کیوں نہیں کرتے۔ میرے سوالوں کا جواب کیوں نہیں دیتے۔'' وہ سایہ ہولے سے اپنی جگہ سے سرکتا اور ہوا میں تیرتا اس کی پائنتی تک آتا۔ خاموشی سے ہولے ہولے سانس بھرتے ہوئے اسے سنتا۔ کبھی کچھ نہ بولتا۔ کوئی تاثر ظاہر نہ کرتا' سوائے انہماک کے تاثر کے۔ جیسے اس میں صدیوں کی ریاضت سے دریاؤں کا ساٹھہراؤ اور اندھی غاروں کا سا سناٹا اتر آیا ہو۔

اس کا خاموش کھڑے رہنا' ہولے ہولے سانس لینا' چالاکی سے اس کی سننا مگر اپنی نہ کہنا' یہ سب باتیں اس کے دل میں زہر کا چکر چلاتیں۔ زہر جو اس کی نس نس میں بھر چکا تھا' اس کے جسم کو اندر سے کاٹتا اور اسے اذیت دیتا۔

ایک دن اس نے اپنی ماں کو بتا ہی دیا کہ اس گھر میں کسی شے کا سایہ ہے جو اسے ستاتا ہے۔ ماں نے آیۃ الکرسی پڑھ کر سارے گھر میں اور خاص طور پر بیٹے کے کمرے میں پھونکیں ماریں۔ اسے ایک سے زائد خواب ایسے یاد آئے جن میں اس آسیب کی نشاندہی کرنے والے ان گنت اشارے موجود تھے۔ اس نے چالیس دنوں کا وظیفہ پڑھا تا کہ معلوم کر سکے گھر کا کون سا کونہ بھاری تھا اور کس شے کا آسیب وہاں مقیم تھا۔ پڑھا ہوا پانی گھر بھر میں اور خاص طور پر بیٹے کے کمرے میں چھڑکا۔ بیٹے کو نظر بد سے بچانے کے لیے اسے تعویذ پہنا دیا اور ایسا ہی ایک تعویذ اس کے کمرے کے دروازے کے ساتھ لٹکا دیا۔ لیکن بیٹے کی بے کلی میں افاقہ نہ ہوا۔

آخر ایک روز اس نے ماں کو کمرے کی وہ نکڑ دکھائی جہاں دیوار پر پچھلے سال کا کیلنڈر ٹنگا تھا اور پاس ہی لکھنے کی میز اور کرسی پڑی تھی' اور بتایا کہ یہیں ہوتا ہے وہ۔ ماں نے نکڑ میں سے کرسی میز پرے سرکایا۔ دیوار پر سے کیلنڈر اتار کر آیۃ الکرسی والا قطعہ ٹانگا۔ کونے میں فرش پر ایک چھوٹی چوکی رکھی اور اس پر دیا جلا کر دھر دیا۔ کمرے میں سرسوں کے جلتے تیل کا دھواں پھیلا تو اس نے دیکھا سایہ اس کی اوٹ میں ہو کر غائب ہو رہا تھا۔ اس دھویں کی اوٹ میں وہ شبیہیں بھی گم ہو گئیں جو دیئے کی لو دیوار پر بنا رہی تھی اور یہ اپنے ذائقے میں ایسا میٹھا اور مزاج میں ایسا بے ضرر تھا کہ اسے کھانسی کا دورہ بھی نہ پڑا جس کا اسے خوف تھا۔ نیند کسی دنیائے دیگر سے نازل ہونے والے خوش گوار پیغام کی صورت اس کی آنکھوں میں اتری اور وہ گہرے اطمینان سے ایسی مکمل نیند سو گیا جیسی طویل برسوں میں اسے کسی رات نصیب نہیں ہوئی تھی۔

شکاری

وہ ایک بے کار رہنے کا شائق شخص ہے۔ بعض لوگ اسے ریٹائرڈ شخص بھی پکارتے ہیں۔

اس کا واحد مشغلہ خوبصورت اور رنگ برنگی تتلیاں اور طرح طرح کی مچھلیاں شکار کرنا ہے۔ اسے ریٹائرڈ شاید اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس نے کبھی کوئی نوکری یا کاروبار وغیرہ نہیں کیا۔ اس کی گزر اوقات باپ کی ترکہ میں چھوڑی ہوئی جائیداد سے حاصل ہونے والی آمدنی پر ہوتی ہے یا پھر اس یافت پر جو کبھی کبھار کوئی چھوٹا موٹا کام کرنے پر ہو جاتی ہے۔

وہ ایک ہٹا کٹا جوان آدمی ہے۔ چاہے تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔ مستقل نوکری نہ سہی یومیہ ہفتہ وار اجرت پر محنت مزدوری ہی سہی یا کچھ بھی اور۔ لیکن اپنے مشغلے کے سوا' جو بالکل منفعت بخش نہیں ہے' کسی اور کام میں اسے سرے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لوگ اسے ریٹائرڈ آدمی پکارتے ہیں تو وہ پلٹ کر جواب نہیں دیتا۔ خاموشی سے سر جھکائے گزر جاتا ہے۔ ان کی طرف مڑ کر دیکھتا بھی نہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ایسے موقعوں پر انہوں نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی پرچھائیاں دیکھی ہیں۔

تتلیاں اور مچھلیاں شکار کرنے کے مشغلے میں ایک عمر بسر کرنے کے بعد اسے اس فن کا گہرا ادراک حاصل ہو چکا ہے۔ وہ ہوا کو سونگھ کر تتلیوں کا ٹھکانہ معلوم کر لیتا ہے اور پانیوں کا بہاؤ دیکھ کر مچھلیوں کی تعداد کا اندازہ لگا لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کی چھٹی حس اتنی ہی صحت مند اور توانا ہے جتنی کسی عام انسان کے دیکھنے، بولنے یا چکھنے کی حس ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن عام لوگ اس کی باتوں کو زیادہ خاطر میں نہیں لاتے۔ خود وہ بھی اپنی مہارت اور مشاقی سے چنداں مطمئن نہیں ہے۔

اس نے طرح طرح کے جال بنا رکھے ہیں۔ گول، چوکور، تین کونوں والے مثلث نما جال، ریشم کی ڈوری والے، سوت کی ڈوری والے، نائیلون کی ڈوری والے' اور ایسے جال بھی جن میں لوہے کے باریک پترے کا پیندا ہے۔ چھوٹی مچھلیوں کے لیے الگ اور بڑی مچھلیوں کے لیے الگ نصف کروی خم دار کنڈیاں ہیں جن کے سرے نوکیلے ہیں۔ وہ ان اوزاروں سے ہوا سے تتلیاں اور پانیوں سے مچھلیاں شکار کرتا ہے۔

اس کے گھر کے برابر ہی ایک کشادہ باغ ہے جس میں ہر موسم میں رنگ رنگ کے پھول کھلتے ہیں۔ ان کی مہک چاروں اور پھیل جاتی ہے اور ہر رنگ اور نوع کی تتلیوں کے جمگھٹ ان پر منڈلاتے ہیں۔ خاص موسموں اور خاص طور پر سال کے معتدل آب و ہوا والے دنوں میں یہاں اتنی تتلیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں کہ ایک میلے کا سماں ہوتا ہے۔ یہ تتلیاں جیسے دنیا بھر سے یہاں کوئی جشن منانے آتی ہوں۔

اس نے ایک بڑے حجم کا بیضوی شکل کا جال بنایا ہوا ہے جسے تتلیوں کے قریب لے جا کر ہوا میں گھماتا ہے۔ پھر نیچے زمین پر رکھتا ہے تو اس میں بہت سی تتلیاں باریک دھاگوں میں الجھی خود کو آزاد کرانے کی تگ و دو کر رہی ہوتی ہیں۔ وہ انہیں کھلے منہ کی اور چوڑے پیندے والی بوتلوں میں

ڈال لیتا ہے۔ بوتل کے کارک میں موجود باریک سوراخوں سے انہیں ہوا پہنچتی ہے۔ اس کے پاس اس قسم کی اتنی بوتلیں ہیں جن کا کوئی حساب نہیں ہے۔ اسکی کپڑوں کی الماری میں، ایلومینیم کے چھوٹے بڑے صندوقوں میں، لکھنے کی میز پر، کتابوں کے اوپر، روشن دانوں میں، کونوں کھدروں میں، غرض کہ کمرے میں ہر جگہ یہ بوتلیں آپ کو دکھائی دیتی ہیں یا پھر بڑے مرتبان ہیں جن میں پانی ہے اور مچھلیاں ہیں۔

اسے یاد ہے اس مشغلے کا آغاز کب اور کس طرح ہوا تھا۔ وہ بہت چھوٹا تھا۔ اتنا چھوٹا کہ بمشکل بھاگ سکتا ہوگا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اسی باغ میں آیا۔ یہی موسم ہوگا کہ تتلیوں کے بادل سے ہر طرف تیرتے تھے اور پھولوں کے رنگوں نے ہر طرف قوس قزح کی صورت پیدا کر رکھی تھی۔ وہ حیرت اور انہماک سے اس منظر کو دیکھنے لگا۔ جیسے کوئی جادو کا اسیر ہو جاتا ہے' بس ایسی ہی کچھ یہ منظر دیکھتے ہوئے اس کی کیفیت تھی۔ اس کے بعد اس کے دن یہیں گزرنے لگے۔

وہ گھاس پر لیٹتا تو وہاں ایک جدا دنیا آباد دکھائی دیتی۔ ننھے منھے جانور گھاس کی ڈنٹھلوں پر اور مٹی میں رینگتے یا پھدکتے۔ وہ انہیں چھو لیتا تو وہ چالاکی سے ایسے دم سادھ لیتے کہ جانو کوئی بے جان شے پڑی ہو۔ وہ پھولوں کی پتیوں کو انگلیوں میں مسلتا۔ پتے منہ میں لے کر چباتا۔ لیکن جو لطف اسے تتلیوں کو چھونے میں ملتا' وہ بے پایاں ہوتا۔ انہیں مٹھی میں لینے کی خواہش نے تبھی اسے بے کل کر دیا تھا۔ کبھی بہت کوشش سے وہ انہیں چھو لیتا تو ان کے پروں کے رنگ اس کی انگلیوں کی پوروں پر اتر آتے۔ یہ اسے اپنے ہی وجود کا حصہ معلوم ہوتے جیسے اس کے اندر سے پھوٹے ہوں۔

اسے اپنے پہلے شکار کا قصہ بھی یاد ہے۔ کیسے وہ اپنے ہاتھوں پیروں کی کپکپاہٹ پر قابو نہیں رکھ پا رہا تھا۔ پہلے بہت دیر تک تتلیوں کے تعاقب میں بھاگتا رہا تاکہ انہیں مٹھی میں لے سکے۔ لیکن وہ آسانی سے ہاتھ کہاں آتی ہیں۔ وہ تھک کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک بڑا سا رومال پھیلا کر پھولوں پر گرایا۔ جب اسے لپیٹ کر اٹھایا تو اس میں کتنی ہی تتلیاں تھیں۔ یہ اس کا پہلا شکار تھا۔ اس کے بعد وہ دریا پر بھی جانے لگا۔ جب اس کا جی تتلیاں پکڑنے سے اوبنے لگتا، وہ دریا کو ہو لیتا۔ یہ زیادہ دور نہیں تھا۔ گھر سے نکل کر چند منٹ ہی کسی سمت میں چلتا تو دریا اس کے سامنے آ جاتا۔ پہلے اسے دریا کی موجوں کا شور سنائی دیتا۔ پھر جامن کے درختوں کے جھنڈ نظر آتے اور پھر کنارہ آب۔ یہ بڑے چوڑے پاٹ والا گہرا دریا تھا۔ طرح طرح کی مچھلیاں اس کی لہروں میں تیرتی دکھائی دیتی تھیں۔ ہر حجم، ہر نسل اور ہر رنگ کی مچھلیاں۔ دور دور سے لوگ یہاں شکار کرنے آتے۔ وہ اپنی کنڈیوں میں کینچوے پرو کر پانی میں ڈال دیتے۔ دریا کے کنارے کنارے نرم بھربھری مٹی میں یہ بہتات میں تھے۔

دریا کے دونوں جانب پتھر کے بنچ نصب تھے۔ شکاری ان پر بیٹھ جاتے۔ ان میں سے کچھ مشاق ہوتے اور کچھ نو آموز۔ وہ آہستہ آہستہ ان سب کو پہچاننے لگا تھا۔ وہ بنچ پر بیٹھے بیٹھے درخت کے تنے سے ٹیک لگا لیتے اور انتظار کرتے۔ دنوں، ہفتوں اور بعض اوقات مہینوں۔ کچھ تھک کر نامراد ہی واپس لوٹ جاتے۔ کچھ مضبوط ارادے کے ساتھ جمے رہتے۔ لیکن شکار زیادہ لوگوں کے مقدر میں نہ ہوتا۔ آہستہ آہستہ وہ بھی شکار کے سارے گھر سیکھ گیا۔ وہ ان مچھلیوں کو بڑے مرتبانوں میں ڈال لیتا۔ ان میں صاف پانی اور عمدہ غذا بھی ڈالتا۔ لیکن کسی غیر معلوم وجہ سے وہ محض چند گھنٹوں میں مر جاتیں۔ تتلیاں تو اس سے بھی جلد فقط چند منٹوں میں۔ وہ یہی سمجھتا رہا کہ وہ ناتجربہ کار ہے اس لیے ان کی صحیح نگہداشت نہیں کر پاتا۔ اس نے تتلیوں اور مچھلیوں کی پرورش سے متعلق بہت سی کتابیں پڑھیں۔ آخر اس پر کھلا کہ یہ نہایت خاص نوع کی تتلیاں اور مچھلیاں مرتبانوں میں آنے

کے بعد ہی نہیں بلکہ ویسے بھی پل پل مرتی رہتی ہیں۔ ان کی لاشیں مٹی میں مل کر فنا نہیں ہوتیں۔ فوراً ہی کئی اور جسموں میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ قفس میں آنے کے بعد تقسیم کا یہ عمل چونکہ منقطع ہو جاتا ہے، اسی لیے ہمیں یہ مردہ دکھائی دیتی ہیں۔

وہ زندہ تتلیاں اور مچھلیاں شکار کر کے بوتلوں اور مرتبانوں میں ڈالتا۔ اگلے روز اسے وہ ساکت پڑی کھائی دیتیں۔ وہ انہیں ہلاتا جلاتا۔ وہ ادھر ادھر لڑھکنے لگتی۔ وہ ان مردہ تتلیوں اور مچھلیوں سے بھری بوتلوں اور مرتبانوں کو سنبھال کر رکھتا۔ پھر انہیں اپنے شکاری دوستوں کو دکھاتا۔ وہ بھی ایسی ہی بوتلیں اور مرتبان اسے دکھاتے، جو رنگ برنگی تتلیوں اور مچھلیوں سے بھرے ہوتے، لیکن سب مردہ۔ کئی ایک تو گل سڑ کر بو دے رہی ہوتی۔ لیکن لوگ انہی کو سراہتے۔ شکاری مطمئن ہو جاتے کہ وہ ان مردہ جانوروں کو شکار کر کے گھاٹے میں نہیں رہے۔

اس کے شکار کی بھی پذیرائی ہوتی لیکن آہستہ آہستہ اس صورت حال سے اس کا جی اکتا گیا۔ وہ اپنے شکار کیے ہوئے جانوروں کو مردہ حالت میں دیکھتا تو افسوس اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ وہ ان سب کو گتے کے ایک بڑے ڈبے میں ڈال دیتا۔ ڈبہ بھر جانے پر اسے گھر سے چند ہزار قدم کے فاصلے پر موجود اندھے گڑھے میں پھینک آتا جہاں وہ مٹی میں مل کر فنا ہو جاتیں۔

قصبے میں گاہے بگاہے میلہ لگتا تھا۔ دور دور سے شکاری اپنی شکار کی ہوئی تتلیوں اور مچھلیوں کے ساتھ آتے۔ یہ سب مردہ ہوتیں۔ ایک بڑے سٹیج پر وہ سب اکٹھے ہوتے۔ پھر ایک ایک سامنے آتا اور تتلیوں سے بھری بوتلوں اور مچھلیوں سے بھرے مرتبانوں کی نمائش کرتا۔ حاضرین ان کی شکارانہ مشاقی کی داد دیتے۔ وہ پذیرائی سے اتنا خوش ہوتے کہ جوش میں چیخ چیخ کر روتے اور ناچتے۔

لیکن ان میں کبھی کبھار ایسا شکاری بھی آتا جس کے پاس زندہ تتلیوں اور مچھلیوں والی بوتلیں اور مرتبان ہوتے۔ کہا جاتا ہے کہ ایسی تتلیاں اور مچھلیاں بھی ہیں جو کبھی نہیں مرتیں۔ یہ بہت دور پہاڑوں کے بیچ گمنام وادیوں میں باغوں اور پہاڑی جھرنوں سے پھوٹتی جھیلوں میں پائی جاتی تھیں۔ کچھ لوگ پیچ دار اور الجھا دینے والی منزلوں کو عبور کرتے وہاں تک پہنچے بھی ہیں لیکن واپس آ کر یہ بات خود بھی بھول جاتے کہ وہاں کیسے پہنچے اور کیونکر واپس آئے۔ یہ سارا سفر ایسے بے خود کر دینے والے وجدان کے زیر اثر طے ہوتا جو ان کی یادداشت کا حصہ نہ بن پاتا۔ یہ جانور اور ان کو پانے والے دونوں کبھی نہیں مرتے۔ یہ ہمارا قابل رشک اور گراں مایہ اثاثہ ہیں۔

وہ حسرت کے ساتھ ان ہمیشہ زندہ رہنے والی تتلیوں اور مچھلیوں کو دیکھتا۔ یہ کتنی مختلف ہوتیں جیسی اس نے کہیں بھی اور کبھی نہ دیکھی تھیں۔ وہ یہ سوچ کر دکھی ہو جاتا کہ وہ انہیں نہیں پا سکا۔ وہ خواہش کرتا کہ یہ اسے اپنے گھر سے چند قدم دور باغ اور دریا ہی سے مل جائیں۔ لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ ایسا اگر ممکن ہوتا تو کوئی بھی شکاری کبھی ان سے محروم نہ رہتا۔

اسی حسرت ناکی میں غرق وہ باغ میں جاتا۔ پھولوں پر ہمیشہ کی طرح تتلیوں کے جھنڈ منڈلا رہے ہوتے۔ لیکن یہ منظر پہلے کی طرح اس کے دل کو خوشی کی روشنی سے بھرتا نہیں تھا۔ وہ اپنے بیضوی پیندے والے جال کے ساتھ ایک طرف جھاڑیوں میں دبک کر بیٹھ جاتا۔ وقت اس کے جسم پر سے گزرنے لگتا۔ نیند اسے تھپکیاں دیتی اور وہ ایک میلے کا خواب دیکھتا۔

"ایک اونچے سٹیج پر وہ مہمان کی کرسی پر بیٹھا ہے۔ عقب میں سفید لٹھے کے بڑے بینر پر سرخ رنگ میں لکھا ہے" ۔۔۔۔۔۔ کے ساتھ ایک شام"۔ کرسی کے ایک جانب میز پر کچھ مرتبان اور بوتلیں دھری ہیں۔ مرتبانوں میں مچھلیاں ہیں جو ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ بوتلوں میں تتلیاں ہیں جو کبھی

نہیں مرتیں۔ ایسی تتلیاں اور مچھلیاں اتنی تعداد میں آج تک کوئی نہیں پکڑ سکا۔ اسے دنیا کا سب سے بڑا شکاری تسلیم کر لیا گیا ہے اور اسی کے اعزاز میں یہ میلہ لگا ہے۔

لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جو سٹیج کے آگے دور تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ جوق در جوق اس کے حاصلات کو دیکھنے آئے ہیں۔ پہلے اس کی توصیف اور اس کی شکارانہ اہلیتوں کے اعتراف میں قصائد پڑھے جائیں گے، مقالے سنائے جائیں گے اور پھر اسے دعوت دی جائے گی کہ وہ ڈائس پر آ کر اپنے مداحین سے خطاب کرے۔ وہ اپنے مرتبانوں اور بوتلوں سمیت کھڑا ہو جائے گا۔ کائنات اس کے پیروں میں آن گرے گی اور موت اس کے لیے باقی نہیں رہے گی۔ وہ اپنے مرتبانوں اور بوتلوں کی بدولت نہ کبھی بوڑھا ہو گا' نہ کبھی مرے گا۔

لیکن پھر اس کی آنکھ کھل جاتی۔ اس کا سر خاردار جھاڑیوں میں الجھا ہوتا۔ اس کے چہرے اور گردن پر تازہ خراشوں کے نشان ہوتے۔ اس کے پہلو میں اس کا بہترین جال پڑا ہوتا جو اس وقت اس کے لیے ایک مردہ جانور سے بھی زیادہ بے حیثیت شے ہوتا۔

اس نے مایوسی کی کتنی ہی شامیں یوں گزار دیں۔ کتنی ہی بار وہ جھاڑیوں میں چھپا چھپا سو گیا۔ دریا کے کنارے بیٹھے بیٹھے اس کی گردن اور کمر اکڑ کر دکھنے لگی۔ چاند، ستارے، آسمان اور دکھائی دینے والی ہر شے اس کی نگاہ میں دھندلانے لگتی۔ اس کی خواہش اس کے وجود کو کھلسا دیتی۔

تب ایک روز اس نے اپنی پوشاک سے ایک بڑا تھیلا بنایا۔ اس تھیلے میں تتلیوں کے لیے جال' بوتلیں اور مچھلیوں کے لیے کنڈیاں، کینچوے اور مرتبان رکھ لیے۔ پھر تھیلے کے منہ کو سوت کی ڈوری سے بند کیا۔ اسے اپنی کمر پر لادا اور اپنے اندر پیدا ہونے والے وجدان کی روشنی میں، جو اسکے پیروں کو اس کی اپنی مٹی سے اکھاڑ رہا تھا، دور پہاڑوں کے بیچ گمنام وادیوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا جہاں باغوں میں ہمیشہ زندہ رہنے والی تتلیاں اور پہاڑی جھرنوں سے پھوٹتی جھیلوں میں مچھلیاں تھیں جو کبھی نہیں مرتیں اور نہ انہیں شکار کرنے والا کبھی مرتا ہے۔

1993ء

تین گھبرو

مزار داتا گنج بخش کے برابر ناولٹی چوک میں کلف لگے ہوئے شلوار قمیص میں ملبوس تین جوانوں نے' جو بھرے ہوئے توانا جسموں والے گھبرو تھے' لبھا دودھ دہی شاپ' سے پیڑوں، دہی اور دودھ والی لسی کے تین بڑے گلاس پئے۔ جمعے کا دن تھا۔ سرکاری چھٹی تھی۔ لیکن ناولٹی چوک میں، اسی چوک کے نام والے ناولٹی سینما کی وجہ سے، خوب رش تھا اور ہر دکان میں عام دنوں کی طرح گہما گہمی تھی۔

پیسے دینے کے لیے تینوں میں خوب تکرار ہوئی۔ مدھرے قد کے چوڑے جثے والے نوجوان، جس کے بال گھنگھریالے اور بالائی ہونٹ کے اوپر نتھنے کے قریب چنے کے دانے جتنا سیاہ موہکا تھا، نے اس شرط پر بل ادا کرنے کی حامی بھری کہ باقی دونوں اسے رتن سینما میں صائمہ کی نئی فلم 'جٹی دا کھڑاک' کے چھ بجے کے شو کا ٹکٹ خرید کر دیں گے۔ کوئی ڈھائی تین کا عمل ہوگا جب وہ ایک دوسرے کو جھپیاں دیتے اور کہنیاں مارتے ہوئے کرسیوں سے اٹھے۔ وہ بہت مسرور معلوم ہوتے تھے اور ایسے ہی ہر شے سے کھیہ کر گزرتے گئے۔

ان میں سے جو سب سے لمبا تھا' سیالکوٹ کے ایک گاؤں گھڑیال کا رہنے والا اور ذات کا نائی تھا۔ وہ ایک سال پہلے روزگار کی تلاش میں لاہور آیا۔ پھر یہیں کا ہو رہا۔ اقبال ٹاؤن میں ایک بیوٹی سیلون میں ملازم تھا۔ بال تراشنے کا فن اس نے اپنے والد کی وفات کے بعد چچا اللہ رکھا نائی سے سیکھا جو کڑا استاد تھا اور ذرا ذرا سی غلطی پر اس کی چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیتا تھا۔ گاؤں سے اس کے بھاگنے کی دوسری کئی وجوہات میں سے ایک یہ روز روز کا منہن بھی تھا۔ باقی دونوں چنیوٹ کے رہنے والے اور ایک پریس میں مشین مین تھے۔ بہت چھوٹی عمر میں گھر والوں سے ناراض ہو کر یا بہتر مستقبل کی تلاش میں دیہات سے بھاگے۔ تینوں ایک ہی کمرے میں رہتے۔ جمعے کے جمعے دھلے اور مائع لگے ہوئے کپڑے پہن کر چھٹی مناتے' آوارہ گردی کرتے اور سینماؤں میں فلمیں دیکھتے۔ اپنے اپنے گاؤں میں تینوں کے گھر تھے لیکن گھر والوں نے ہی کبھی ان کی خبر لینے کی خواہش محسوس کی نہ انہیں کچھ فکر تھی۔

نگار سینما میں تینوں 'شیر پنجاب' کی نمائشی تصویریں دیکھتے ہوئے بار بار ایک تصویر پر نظریں جما کر ٹھہر جاتے جس میں نیم برہنہ حالت میں انجمن بارش میں نہاتی ہوئی ناچ رہی تھی۔ کچھ پرے سلطان راہی سینہ تانے بھنویں چڑھائے اور بازوؤں کو خوب پھیلائے کھڑا اسے قدرے ناراضی کے تاثر کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ اداکارہ کے جسم کے برہنہ حصوں پر نظریں چپکائے وہ ایک دوسرے کے قریب ہو ہو کر ہوکے بھرتے۔ ان کے پاس کچھ زیادہ پیسے ہوتے تو فلم کے پروگرام کو رہنے دیتے اور ہیرا منڈی چلے جاتے۔ اس امکان پر انہوں نے بات بھی کی۔ لمبے قد کے نوجوان نے' جو تینوں میں تنومند اور مضبوط جثے کا تھا' اپنی مونچھوں پر زبان پھیر کر لسی کی باقیات پونچھتے ہوئے کہا "مہینے دی آخری تریخاں وچ جیباں ای نہیں' ہر شے ٹھنڈی پئی ہوندی اے۔" اس بات پر اس سمیت تینوں دوستوں نے بھرپور قہقہہ لگایا۔

کوئی بیس ایک منٹ بعد وہ سینما سے نکلے۔ ان کا پروگرام تھا کہ اپنے مشترکہ دوست فیتے کی طرف چلیں جوان کے خیال میں ضرور اپنا سکوٹر دھو رہا ہوگا کہ چھٹی کا دن وہ عام طور پر ایسی ہی بے کار مصروفیات کی نذر کرتا۔ وہ گھر بار والا آدمی تھا اور انہیں زیادہ وقت نہیں دے پاتا تھا۔ اس بات کا انہیں بہت قلق تھا۔ اسی اثناء میں ان کی توجہ بھاٹی گیٹ کے باہر گندے نالے کے برابر بنے پارک سے اٹھتے شور وغوغا نے اپنی طرف پھیر لی۔ معلوم ہوا کہ وہاں قومی مسلمان پارٹی ع گروپ کا جلسہ ہو رہا تھا۔ سربر آوردہ لیڈر کرامت اللہ ملک گلا پھاڑ پھاڑ کر مخالف 'قومی لبرل پارٹی' کی خاتون سربراہ اور دیگر لیڈروں کے لتے لے رہا تھا۔ انتخابات کا موسم تھا اور لگتا تھا سارے شہر کو الیکشن ہو گیا ہو۔ شہر میں خوب گہما گہمی تھی۔ دیواریں پوسٹروں، چھتیں مختلف پارٹیوں کے جھنڈوں اور سڑکیں بینروں سے لدی پھندی تھیں۔ الیکشن جیتنے کیلئے ہر لیڈر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا اور تجوریوں کے منہ کھل گئے تھے۔

جانے کرامت اللہ ملک نے کیا بات کہی۔ تاہم تینوں لفظ 'رنڈی' سن کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''کیہڑی اے بھئی رنڈی ایتھے۔'' لمبے جوان نے کسی مستی میں جھومتے ہوئے کہا۔ تینوں جلسہ گاہ کی طرف چل پڑے۔ کوئی ڈھائی تین سو کے قریب لوگ پارک میں اور فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ سامنے درختوں کے جھنڈ کے برابر تنبو کے نیچے جلسہ ہو رہا تھا۔ سٹیج پر بڑے بڑے لیڈر بیٹھے تھے۔ کرامت اللہ ملک جیسے کئی ایک لیڈر اپنی کہہ چکیں گے تو پھر ان بڑے لیڈروں کی باری آئے گی۔ تب تک جلسہ گرم ہو چکا ہوگا۔ وہ مجمع میں ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے۔ آس پاس لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں موجود تھے۔ پارک کے اندر البتہ دریاں بچھی تھیں جہاں لوگ چوکڑیاں مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ تاہم زیادہ تر یا تو موجودہ سیاسی صورت حال پر پر جوش انداز میں تبصرہ کر رہے تھے یا خاموشی سے پرے سٹیج پر بیٹھے لوگوں کو یوں بغور تک رہے تھے جیسے وہاں ہونے والی سرگرمی میں سے کوئی معنی اخذ کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ان تینوں کا دھیان برابر تقریر میں اٹکا ہوا تھا اور وہ چاہتے تھے مقرر اس لفظ 'رنڈی' کی مزید وضاحت کرے۔ کرامت اللہ نے کچھ توقف کیا تو کسی نے مجمع میں سے نعرہ بلند کیا ''ارباز ساڈا شیر اے، باقی ہیر پھیر اے۔'' مجمع میں سے کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں جو آہستہ آہستہ بڑھتی گئیں حتیٰ کہ یوں محسوس ہوا جیسے سارا مجمع ان نعروں کے اثر تلے چیخ رہا ہو۔ ان آوازوں کی یکجائی سے بلند آہنگ نعرے فضا میں گونجنے لگے۔ ''آوے گا بھئی آوے گا، شیر پنجاب دا آوے گا''۔ ''ہور نئیں کوئی ہور نئیں، ارباز توں ودھ کے ہور نئیں''۔ ''پاکستان دی اک آواز، ارباز ارباز ارباز''۔

انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ سٹیج پر بیٹھے لیڈران میں مولانا ارباز خان بھی شامل تھے۔ انہوں نے اونچے شملے والی پگڑی پہن رکھی تھی اور ان کے چہرے پر مدبرانہ تفکر کی پرچھائیاں تھیں جیسے وہ کسی اہم قومی مسئلے پر غور وخوض میں غلطاں ہوں۔ دیر تک جوش وخروش کے ساتھ نعرے لگتے رہے جن میں وہ تینوں جوان اپنے جسم جھلاتے اور بازوؤں کو فضا میں لہراتے آواز سے آواز ملا رہے تھے۔ اس بات نے انہیں اتنا مزہ دیا کہ خاموش ہونے کے باوجود دیر تک وہ اسی مستی میں آنکھیں اوپر چڑھائے جھولتے رہے۔

کرامت اللہ کی آواز پھر سے لاؤڈ سپیکر سے گونجی ''میرے ہم وطنو ہماری غیرت ہمیں للکار رہی ہے۔ کیا ہمیں گوارا ہو سکتا ہے کہ ہماری مائیں بہنیں بیٹیاں جلسوں میں تقریریں کریں۔ سڑکوں پر مردوں کے ساتھ جلوس نکالیں۔ دوسرے ملکوں میں جا کر مردوں سے ہاتھ ملائیں۔ سیاست

مردوں کا کھیل ہے' عورتوں اور زنخوں کا نہیں۔ شریفوں کی بہو بیٹیاں بازار میں نہیں آتیں۔ بازار میں آنے والیاں اور ہوتی ہیں۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر تقریریں نہیں کرتیں۔ گھروں میں بیٹھ کر بچے پالتی ہیں۔ ہم سیاست کو ان بازاری اور بے حیا عورتوں سے پاک کر دیں گے۔ ان کو جوتیاں مار کر ان کے گھروں میں واپس بھیج دیں گے۔'' یہاں پھر سے نعرے بلند ہوئے' اس بار زیادہ جوش اور ولولے کے ساتھ۔ جوں جوں اس کی تقریر زیادہ بے باک اور فحش ہو رہی تھی' پبلک اور خاص طور پر تینوں دوستوں کا جوش سوا ہو رہا تھا۔ وہ پورا گلا کھول کر ممکنہ حد تک بلند آواز میں 'قومی مسلمان پارٹی' کے حق میں نعرے بلند کر رہے تھے۔ دیر تک کرامت اللہ ملک اپنی خطابت کے جادو جگاتا رہا۔ 'قومی مسلمان پارٹی' کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا رہا۔ نعرے لوگوں کو گرماتے رہے۔ حتیٰ کہ اس نے اپنی تقریر ختم کی اور قومی مسلمان پارٹی زندہ باد کے نعروں کے ساتھ سٹیج سے نیچے اتر آیا۔ کمپیئر نے مائیک سے منہ لگا کر چیختی ہوئی آواز میں' جو پھٹے ہوئے گلے کی سسکاریوں کی سی تھی' اللہ دتہ کھوکھر کو دعوت دی کہ وہ ڈائس پر آئیں اور عوام سے خطاب کریں۔

تینوں جوان ویسے ہی نعرے مارتے ہوئے بھیڑ میں سے نکل گئے۔

''چیتا لگا اے۔'' ان میں سے ایک جوش سے بولا جو اس تقریر سے بہت متاثر معلوم ہوتا تھا۔ اسے معروف اداکار یوسف خان کی فلم 'لیڈر' یاد آ رہی تھی جس میں اس نے ایسے ہی جوشیلے انداز میں تقریر کر کے مخالف پارٹی کے لیڈروں کی کالی کرتوتوں کے پول کھولے تھے۔ وہ تینوں متفق تھے کہ ان دنوں میں اگر وہ فلم سینما میں لگے تو بو ابزنس کرے۔ ان کا رخ لوہاری گیٹ کی طرف تھا جہاں سے انہیں میو ہسپتال کے راستے میکلوڈ روڈ کی طرف ہو لینا تھا۔ راستے میں کافی فاصلے تک انہیں لوگوں کی ٹولیاں جلسہ گاہ کی طرف جاتی دکھائی دیں۔

اردو بازار کے سامنے موری دروازہ کے بازار میں انہوں نے تانگہ سٹینڈ کے برابر مٹی کی کچی دیواروں اور چھت والی دکان سے پانچ روپے کے بھنے ہوئے سیاہ چنے خریدے اور پھکنے مارتے ہوئے ایک طرف بس سٹاپ کے قریب کھڑے ہو کر سڑک پر آتی جاتی ٹریفک کا نظارہ کرنے لگے۔ تیکھے نقوش والے گبھرو کو بھوک لگی ہوئی تھی۔ وہ چاہتا تھا آگے بڑھنے سے پہلے سامنے ریڑھی سے پھٹورے کھائے جائیں۔ تاہم وہ دوستوں کی نظر کی سیدھ میں ایک ویگن کی طرف متوجہ ہوا جس کی اگلی سیٹوں پر بیٹھی دو عورتوں نے تینوں کی نظروں کو کسی مقناطیس کی طرح اپنے ساتھ چپکا لیا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو کہنیاں ماریں۔ دروازے کے ساتھ بیٹھی عورت نے ان کی نظروں کا بھرپور جواب دیتے ہوئے اپنی چادر کان کے قریب سے درست کی اور برابر بیٹھی دوسری عورت کو ان کے بارے میں بتایا۔ اس نے بھی گردن آگے بڑھائی اور مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔

''مال اے'' ۔ ان میں سے ایک نے وہی جلسے کے نعرے والے ردھم میں سرگوشی کی۔ تینوں قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔

جب تک ویگن چلی نہیں' کھڑکی کے برابر بیٹھی عورت بار بار سر موڑ کر انہیں تکتی رہی۔ شاید ایک بار اس نے تینوں میں سے کسی کے اشارے کے جواب میں آنکھیں نچائیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟

''لے چلیئے۔'' تیکھے نقوش والے جوان نے کہا۔

''پر کتھے۔'' باقی دونوں میں سے کوئی بولا اور سب کے منہ لٹک گئے۔ وہ خاموشی سے چنے کی پھنکیاں مارنے لگے۔ یہ ایسا سوال تھا جس کا

جواب ان میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔

''لعنت ہے یار'' مدھرے قد والے نے کسی سخت چنے کے دانے کے ڈاڑھوں تلے آ کر ٹوٹنے پر کہا اور منہ ایسا برا بنایا جیسے کسی بات کا مزا کرکرا ہو گیا ہو۔ جانے لمبے قد والے کے جی میں کیا آئی وہ قمیص کا دامن جھاڑتا ہوا ان عورتوں کی طرف بڑھا لیکن اسی لمحہ ویگن چل پڑی اور جب تک وہ اس کے قریب پہنچے' وہ آگے نکل گئی۔

لوہاری گیٹ تک آتے آتے جب وہ یہ طے نہیں کر پائے تھے کہ پہلے لکشمی چوک جائیں فالودہ کھانے کے لیے' یا فیتے کی طرف چلیں' انہیں دور سے کسی دوسرے سیاسی جلسے کا شور سنائی دیا۔ دیہاتیوں اور مزدوروں سے لدی ہوئی چند ایک سوزوکی پک اپ اور ویگنیں' جن پر دو رنگے جھنڈے' جھنڈیاں اور قومی لبرل پارٹی کے رہنماؤں کی تصاویر والے بینر لگے تھے' انہیں آگے جاتی دکھائی دیں۔ پتہ چلا کہ موچی گیٹ کا تاریخی پارک ساری گہما گہمی کا مرکز ہے۔ وہاں پارٹی کی سربراہ خاتون لیڈر بھی خاص طور پر آ رہی تھی۔ لوہاری گیٹ سے آگے' نیا بازار' چوک میں آ کر' جہاں سے انہیں سامنے میو ہسپتال روڈ کی طرف مڑنا تھا' وہ خاتون لیڈر کو دیکھنے اور سننے کے تجسس کو مزید نہ دبا سکے اور موچی دروازے کی طرف ہو لیے۔

جیسے جیسے وہ جلسہ گاہ کے قریب ہوئے لوگوں کا ہجوم، لاؤڈ سپیکروں سے بلند ہوتی پر جوش تقریر اور سیاسی کارکنان کے نعروں کا شور اور چھوٹی بڑی پک اپ ویگنوں اور کوچ گاڑیوں کا اژدھام بڑھتا گیا۔ کہیں اونچی آواز میں ٹیپ ریکارڈر پر نغمے لگے تھے جن میں بار بار قومی لبرل پارٹی اور اس کے لیڈروں کا ذکر توصیفی انداز میں آتا۔ جگہ جگہ کھڑے پارٹی ورکر نہایت بے تکلفی سے آنے جانے والوں کو روک کر ان کی قمیصوں پر پارٹی کے پن والے بیج لگا رہے تھے۔ سڑک کے آر پار دو رنگوں والی جھنڈیاں لگی تھیں۔ ٹریفک اور ہجوم آپس میں یوں گڈمڈ تھے کہ ایک دوسرے کا حصہ معلوم ہوتے۔

پارک میں پنڈال سجا تھا۔ اونچا سٹیج' سامنے کرسیوں پر بیٹھے اور ارد گرد کھڑے سینکڑوں کی تعداد میں حاضرین' کارکنان کا جوش و خروش' سپیکر پر جوشیلے انداز میں خطاب کرتا لیڈر۔ اس منظر نے تینوں دوستوں میں نئے سرے سے ولولہ پیدا کیا اور وہ پارک کے اندر چلے گئے۔

مقرر کہہ رہا تھا ''ہم نے دیکھ لیا کہ ان حلوہ خوروں کے کرتوت کیا ہیں۔ یہ مذہب کا نام لے کر عوام کو الو بناتے ہیں۔ دوسروں سے کہتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں خرچ کریں اور خود عوام کے خزانے سے پیسہ نکال نکال کر اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں۔ دوسروں کے بچوں کو مدرسوں میں جانے کی نصیحت کرتے ہیں اور خود ان کے بچے آکسفورڈ اور ہارورڈ میں پڑھتے ہیں۔ دوسروں کو لڑواتے اور کٹواتے ہیں۔ خود عیش کرتے ہیں۔ اپنے بچوں کو امریکہ اور برطانیہ سیٹل کرواتے ہیں۔ میرے دوستو انہوں نے عوام کو خوب الو بنایا۔ ہم انہیں مزید برداشت نہیں کریں گے۔ 'اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں۔۔۔ یہ گندے انڈے۔'' اس بات پر سارے پنڈال میں خوب تالیاں پیٹی گئیں اور خوب قہقہے بھی لگے۔ پبلک نے جوشیلے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس جوش و خروش نے تینوں دوستوں کو جیسے مست کر دیا۔ نشے کی لہر سی ان کے خون میں دوڑ گئی۔ اپنی مضبوط چھاتیوں کے زور سے بلند آواز میں نعرہ بازی کرتے ہوئے وہ بار بار پیروں پر اچھلتے۔

'حلوہ پارٹی مردہ باد' 'شیر عوام' عوام کی شان' عظمت کا نشان' سیاست کی پہچان'۔

مقرر نے لوگوں کو نعرے مارنے کا کچھ وقت دینے کے بعد پھر سے کہا'' آیئے ہم سب مل کر ان بدکردار لوگوں کو سیاست سے نکال باہر کریں۔آیئے تاریخ کا ایک نیا باب لکھیں۔قومی لبرل پارٹی کو ووٹ دے کر کامیاب بنائیں۔میرے بھائیو اور بہنو آؤ یہ عہد کریں کہ ہم قوم کے دشمنوں سے انتقام لیں گے۔انہیں اٹھا کر مقدس ایوانوں سے باہر پھینک دیں گے۔انہیں ملیامیٹ کر دیں گے۔اس دھرتی کو ان کے وجود سے پاک کریں گے۔میرے ساتھ آواز ملا کر کہیے۔'قومی مسلمان پارٹی مردہ باد۔قومی لبرل پارٹی زندہ باد۔'' اس کے بعد تو نعروں کا ایسا ریلا بہا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔جیسے عوام کسی جادو کے اثر میں ہوں' اور سب کے ساتھ لہک لہک کر دھمال ڈالتے ہوئے بانہیں الار الار کر نعرے مار رہے تھے' یہ تینوں گھبرو۔

جو لوگ پارک کے سامنے سڑک پر تانگوں، ریڑھوں، رکشوں اور ویگنوں میں بیٹھے گزر رہے تھے' وہ بھی اس شور میں اپنا حصہ ڈالے بغیر نہ رہ پاتے۔نعروں کا شور ختم ہوتا تو مقرر پھر سے شروع ہو جاتا۔آہستہ آہستہ اس کی تقریر میں دشمنوں کو نیست و نابود کرنے' جلا کر راکھ کر ڈالنے' خون اور خنجر جیسے الفاظ کی بھرمار ہوتی گئی جس سے حاضرین جلسہ کا ولولہ دیدنی ہو گیا۔یہ ایسا جوش تھا جو ہر آن بڑھتا اور اسی حساب سے وقفے وقفے سے ان کے نعروں کا شور بھی۔

اس کے بعد ایک علامہ صاحب ڈائس پر آئے جنہوں نے قرآن و سنت کی روشنی میں عورت کی حکمرانی کو افضل ثابت کرنے کے لیے دلائل دینے شروع کیئے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تینوں کا ذوق و شوق ہوا نکل جانے والے غبارے کی طرح بالکل ہی لنج منج ہو گیا۔تینوں ہجوم میں دھکم پیل کرتے ہوئے اپنا راستہ بناتے پارک سے باہر نکل آئے۔مقرر کی جرات رندانہ اور آواز کی گھن گرج سے تینوں از حد مرعوب تھے۔وہ بار بار توصیفی انداز میں سر جھٹک کر ایک دوسرے کو دیکھتے اور کہتے'' کمال ہو گیا۔مزا آ گیا۔''

ریلوے روڈ سے گزر کر وہ لاہور ہوٹل کے قریب نکلے اور لکشمی چوک کی طرف ہو لئے جہاں شو شروع ہونے کے وقت تک تینوں نے ایک ہوٹل کے باہر بنچوں پر بیٹھ کر فالودہ کھایا' بلند آواز میں ایک دوسرے پر پھبتیاں کسیں اور فحش لطیفے سناتے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر قہقہے لگائے۔بل کی ادائگی کے لیے ان کے بیچ پھر سے خوب یدھ پڑا۔آخر لمبے قد والے جوان نے اپنا بٹوہ نکالا اور سو کا نوٹ چھوکرے کو دیا جس نے اسے پینتیس روپے واپس لا کر دیئے اور ایک طرف کھڑا ہو کر زدیدہ نگاہوں سے انہیں اس امید میں تکنے لگا کہ وہ اسے کچھ بخشیش سے نوازیں گے۔تینوں دوست چھوکرے کو سرے سے نظر انداز کرتے ہوئے انجمن کی ایک فلم 'انتقام دی اگ' کے بارے میں' جس کا بڑا سائن بورڈ ایک اونچے کھمبے پر لگا تھا' بات کرتے ہوئے سڑک کی پرلی جانب چلے گئے۔یہ فلم انہوں نے کوئی ڈیڑھ ایک ماہ پہلے دیکھی تھی۔وہ گاگا کر ان گانوں کو یاد کرنے لگے جن میں انجمن نے اپنے رقص اور بھرے ہوئے جسم کے جادو جگائے تھے۔''بڑی چنچل ڈانسر اے۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

فلم کے ایک سین پر وہ تینوں اپنے کمرے میں آنے کے بعد بھی خوشگوار حیرت کے ساتھ بات کرتے رہے جس میں' جتی' یعنی صائمہ نے اپنے دشمن چوہدریوں کو، جو تعداد میں سات تھے، چھرے مار کر ہلاک کیا تھا۔ان چوہدریوں نے اس کی عزت لوٹی اور اس کا گھر بار جلا کر راکھ کر دیا

تھا۔ کیسے وہ عورت' جو کسی زخمی شیرنی کی طرح نڈر اور وحشی تھی، ان کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک ایک کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتارتی گئی۔ کیسی ہاؤ ہو اس سین کے دوران سینما ہال میں مچی تھی۔ بڑھکیں اور سیٹیاں مارتے ہوئے فلم بین یوں عورت کے ساتھ تھے جیسے خود بھی انہیں ان چوہدریوں سے پرانی دشمنی اور نفرت کے حساب چکانے تھے۔ اس نفرت کو تینوں نے اپنے دلوں میں یوں زندہ محسوس کیا کہ اگر چوہدری ان کے ہاتھ لگ جاتے تو جانے یہ ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے۔

رات کے کسی پہر مدھرے قد والے جوان نے خواب میں اپنی ماں کو پیٹ کے درد سے تڑپتے اور بے حال ہوتے ہوئے چیخیں مارتے اور روتے دیکھا۔ اس سے ماں کی اذیت ضبط نہ ہو سکی اور وہ خود بھی دھاڑیں مار کر رو پڑا۔ اسی کیفیت میں اٹھ بیٹھا اور جاگنے کے بعد بھی اسی شدت سے بچوں کی طرح بلکتا ہوا رونے لگا۔ دو سال ہوئے اس کی ماں کینسر سے جاں بحق ہوئی تھی۔ اس کے پیٹ میں رسولی تھی جو ہر وقت پھوڑے کی طرح دکھتی اور جس کے زہر نے اس عورت کو ایک ڈھانچے کی صورت دے دی تھی۔ دیہات میں جتنا علاج ممکن تھا' وہ انہوں نے کیا۔ لیکن کوئی دوا کارگر ثابت نہ ہوئی۔ اس کے دونوں ساتھی جو برابر ہی چارپائیوں پر پڑے سو رہے تھے' گھبرا کر اٹھے اور اسے دلاسہ دینے لگے۔ لیکن اس کا گریہ ساون کے بادل کی طرح جل تھل ہر شے کو اپنی نمی میں بھگو رہا تھا۔

''میری ماں مر گئی۔ اوئے ربا۔ بڑی تکلیف اٹھائی اس نے۔''

''حوصلہ کر یار۔'' کسی نے اس سے کہا جبکہ خود اس کے لہجے میں بھی دکھ کی بھیگ تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر سے رونے لگا جیسے اسے کوئی بھولی بات یاد آ گئی ہو۔

''ماواں ٹھنڈیاں چھاواں۔ بڑا پیار کرتی تھی مجھ سے۔ میرے بچے کھِڈانا چاہتی تھی۔ پر مر گئی بے چاری۔ بڑی اذیت میں مری اوئے میرے یار با۔'' آہستہ آہستہ ان دونوں کا دل بھی غم کے بوجھ سے بھنچنے لگا اور ان کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

تیکھے نقوش والے گھبرو کو بھی اپنی ماں یاد آ گئی جو گاؤں میں اس کے انتظار میں بوہے پر نظریں جمائے رہتی تھی اور جس سے وہ کئی ماہ سے ملنے نہیں گیا تھا۔

''ماواں ٹھنڈیاں چھاواں ہوندیاں نیں۔'' اس سے آگے وہ کچھ بھی نہ کہہ پایا اور ہچکیاں لے کر ڈھیرے ڈھیرے رو دیا۔ تیسرا بھی دلاسہ دینا چھوڑ کر ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے پہلے تو منہ بسورتا رہا پھر اپنا گریہ نہ روک پایا۔ سو یوں ہوا کہ سارے میں ماتم کا دھواں بھر گیا۔ دکھ کی بھیگ نے ہر شے کو نم کر دیا۔

تینوں گھبرو رات کے اندھیرے میں باغبانپورہ کے چھوٹے سے محلے کے ایک نیم تاریک کمرے میں اپنی چارپائیوں پر بیٹھے اپنے مرے ہوؤں کو یاد کر کے آنسو بہا رہے تھے' اسی فطری اور بے ساختہ جذبے کے ساتھ جیسے وہ کسی جلسے میں ہوں اور ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی نعرے لگا رہے ہوں۔

دستک

میں چلتا رہا، جانے کب تک کہ آخر یہ راستہ ایک چوڑے اور کھلے بازار میں آ کر ختم ہو گیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میں بوہے کی پرلی جانب چھوڑ آیا تھا۔ ویسا ہی بازار لیکن ذرا سا چوڑا' وہی دھوپ لیکن ذرا نکھری ہوئی' ویسے ہی لوگ لیکن ذرا۔۔۔۔۔

ہولے ہولے پہلے سے کم ہوتے درد کی خوشی میں مجھے ہلکا ہلکا سا یاد آیا کہ یہ سب کچھ نیا نہیں تھا۔ کچھ دیکھا بھالا سا' کچھ جانا پہچانا سا تھا۔ میں جان گیا کہ نہ ہی ایسا پہلی بار ہو رہا تھا۔ ہر بار شاید ایسا ہی ہوتا ہے۔

میرا تعلق شاید دستک دینے والوں کی آخری پیڑھی سے ہے۔ لیکن کیا واقعی یہ آخری ہے یا مجھے ایسا لگتا ہے۔ کون جانتا ہے۔

اپنی یادوں کے گودام میں جھانکتا ہوں تو اتنا کاٹھ کباڑ ہے وہاں کہ الجھن ہوتی ہے۔ لیکن بہت سی بے کار یادوں میں ایسے چمکدار، رنگ برنگے' دلچسپ اور تاباں ستارے بھی ہیں جن کی روشنی وہاں کبھی مکمل اندھیرا نہیں ہونے دیتی۔ اور یہی ہیں جو بار بار اس دم گھونٹی جگہ آنے پر مجھے مائل کرتے ہیں۔ دستک سے میرے اولین تعارف کی یاد بھی ایسا ہی ایک ستارہ ہے۔

مجھے یاد ہے ہمارے گھر کے پچھلے بڑے کمرے کے بوہے پر میں دیر تک ہاتھ مار مار کر روتا رہا تھا۔ حتیٰ کہ میں تھک گیا اور میرے ہاتھ دکھنے لگے۔ لیکن بوہا نہیں کھلا۔

اس روز میں سکول سے لوٹا تو میں نے دیکھا کہ ہمارا گھر محلے کی عورتوں مردوں اور بہت سے دور نزدیک کے رشتہ داروں سے بھرا ہوا ہے۔ اپنے گھر میں اتنا مجمع میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ باہر کا دروازہ بھی چوپٹ کھلا تھا جیسے کوئی پورا منہ کھولے لیٹا سو رہا ہو۔

عورتوں نے مجھے کھینچ کر اپنے پاس ہی بٹھانا چاہا لیکن میں نے پچھلے کمرے میں' جس کا بوہا بند کیا جا رہا تھا، اپنی ماں کو زار و قطار روتے، چھاتی پر دوہتھڑ مارتے اور پچھاڑ کھا کر گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میں بستہ ایک طرف پھینک کر بھاگتا ہوا بوہے کی طرف گیا لیکن وہ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی بھیڑ دیا گیا۔

عام طور پر ایسا نہیں ہوتا تھا۔ میں روزانہ سکول سے لوٹنے پر کنڈی کھڑکاتا تو ماں جو چند ہی قدم دور باورچی خانے میں بیٹھی ہوتی، فوراً آتی اور بوہا کھول دیتی۔ مجھے ذرا بھی انتظار نہ کرنا پڑتا۔ لیکن اس روز پہلی بار کسی نے میری دستک کا جواب نہیں دیا۔ دستکیں بے فیضی بھی ہوتی ہیں' یہ مجھے تبھی پہلی بار پتہ چلا۔

مجھے یاد ہے استاد رحمتا صاحب نے ٹوکا تھا جب ان کے سامنے میں نے یہ الفاظ دہرائے "بے فیضی دستکیں"۔

"دستکیں نہیں، بوہے فیض دیتے ہیں۔ اور بوہے بھی کیا اسے کھولنے والا، اور اسے کھولنے والا بھی کیا۔ دستک دینے والا ہی تو اسے کھولنے

والا بھی ہوتا ہے۔'' میرے پلے یہ باتیں نہیں پڑتی ہیں۔لیکن استاد رحمتا کی خیر ہے۔انہیں یہ پھبتی ہیں۔وہ باوا لوگ ہیں۔

دوسری بار یہ دستک بوہے پر نہیں، مرے دل پر ہوئی اور اس کی گونج اب بھی ایک مسلسل شور کی طرح میرے اندر جاری ہے۔

وہ میری ماموں زاد تھی۔مجھ سے دو ایک برس بڑی ہی ہوگی۔میں اسے کن انکھیوں سے دیکھتا تھا۔تو ایک بار اس نے مجھ سے کہا کہ وہ اوپر میرے کمرے میں آئے گی۔وہ بوہے پر دستک دے گی۔میں پٹ کھول دوں گا اور پھر۔۔۔۔۔۔

وہ اپنی ماں کے ساتھ ہمارے گھر آئی۔شام تک وہاں رہی۔میں اوپر کمرے میں بند بوہے کی پرلی طرف سے آنے والی ہر ہر آہٹ پر کان لگائے سارا دن بت بنا بیٹھا رہا۔حتیٰ کہ میرا سانس میرے گلے میں پھنسنے لگا اور میں دیوانہ وار بھاگتا ہوا بوہا کھول کر باہر چھت پر آ گیا جہاں رات کا گھپ اندھیرا منہ پھاڑے کھڑا تھا اور نیچے تمام گھر والے سو چکے تھے۔

وہ ایک دستک جو میرے کمرے کے بوہے پر ہونا تھی، میرے دل میں گونجی اور یہ گونج وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھی۔اس دستک کے انتظار کی ڈور نے میرے سانسوں کو باندھا ہوا ہے۔یہ ڈور میرے ہر طرف ایسی شدت سے کسی ہوئی ہے کہ میرے ماس میں کھبی جاتی ہے۔مجھے بے کل رکھتی ہے۔

اس بے کلی نے مجھے کہاں کہاں خجل نہیں کیا۔باپ کی وفات کے بعد میرے بڑے بھائی ہی نے ہم بہن بھائیوں کو پالا۔بہنوں کو بیاہا۔چھوٹے بھائیوں کو پڑھایا۔مجھ سے بڑے بھائی نے تو دکان کھول لی۔مجھ سے کوئی ڈھنگ کا کام کبھی نہیں ہو سکا۔نہ پڑھائی لکھائی سے ہی کبھی رغبت پیدا ہوئی۔سمجھو تو یہ ذات کی بڑی کجی ہے۔پر میں ایسا ہی ہوں۔سکول میں ہی پڑھائی سے بھاگا۔پتہ نہیں نویں میں یا اس سے بھی پہلے۔میرے والد نے مجھے سائیں بشیر کے پاس بٹھا دیا' ڈینٹنگ پینٹنگ کا کام سیکھنے کے لیے۔

لیکن میرا شوق پتنگیں اڑانے کا تھا۔گڈی گراونڈ میں کیا پیچ پڑتے تھے۔اب تو اس فن کی کوئی وات نہیں پوچھتا۔تب کی دنیا ہی اور تھی۔بڑے بڑے استاد تھے۔ان کے قدموں میں بیٹھ کر میں نے یہ کام سیکھا۔پیچ پڑتا تو میرے جسم میں اپنے آپ ایسی لہریں اٹھتیں کہ لگتا یہ انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا ہے۔پتنگ تارہ ہو جاتی۔میں ڈور کو اک تارے کی طرح انگلی سے چھیڑتا ہوا چھوڑتا جاتا۔لمبے پیچ پڑتے۔دیکھتے ہی دیکھتے دس دس گوٹوں کا پنا یوں کھل جاتا کہ پھونس جھڑنے لگتا۔

گورنمنٹ نے ریلوے سٹیشن سے اٹھا کر بسوں کے اڈے گڈی گراونڈ کے پاس لا کھڑے کئے تو وہاں کا ماحول ہی بدل گیا۔جمعے کے جمعے پیچ تو اب بھی پڑتے ہیں پر میرا دل اٹھ گیا وہاں سے۔بلکہ اس کام ہی سے۔

تو میں نے للاری چائے والے کے پاس بیٹھنا شروع کیا۔وہاں بڑا تگڑا جواء کھیلا جاتا تھا۔دو ایک دفعہ کھیلا مگر ہار گیا۔لیکن ایک اور کام میرے مطلب کا وہاں نکل آیا۔میرا یار بالا ٹیناں والا جوا کراتا تھا۔میں اس کے کن ٹٹوں میں شامل ہو گیا۔ایک طرف ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھے رہو۔نظر رکھو کہ کیا ہو رہا ہے۔اور جہاں پھڈے کا سماں بندھے فوراً صلح صفائی کرانے پہنچ جاؤ۔ہلکی پھلکی بدمعاشی کا بھی تڑکا لگانا پڑتا تھا کبھی کبھار۔میرا دل وہاں لگ گیا اور یہ سب کچھ یونہی رہتا اگر ایک روز وہاں پولیس کا چھاپا نہ پڑتا۔بڑی مشکل سے میں اپنی جان بچا کر بھاگا۔بالا پولیس کے

ہتھے چڑھ گیا۔ بڑا عرصہ میں چھپا رہا۔ بالا جیل سے ضمانت پر رہا ہوا اور اس نے یہ کیس خارج از دفتر کرایا تو میری جان خلاصی ہوئی۔ اس کے بعد میں کبھی للاری کی دکان پر چائے پینے بھی نہیں گیا' جوا تو پھر دور کی بات ہے۔

لیکن اس کے بعد زندگی میں رہا بھی کچھ نہیں۔ یکبارگی جیسے کسی نے زندگی کے تختہ سیاہ پر ڈسٹر مار کر ساری لکھت پونچھ ڈالی ہو۔ یوں لگتا جیسے کوئی بات تھی جو سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ جیسے پتنگ کٹ کر بے سمت ہو جاتی ہے۔ بس جدھر ہوا لے چلے' چلی جاتی ہے۔ ایسے ہی میں بھی ادھر ادھر پلٹے کھاتا پھرا۔

میں ویرانوں میں اور مزاروں پر جا کر بیٹھا رہتا۔ آنے جانے والوں کو تکتا۔ کسی کے پاس میرے درد کا دارو نہیں تھا۔ گلاب کے پھولوں' اگربتی اور جلتی ہوئی موم کی خوشبو، میرے دماغ میں رچ بس گئی۔ ہر ہر نشہ میں نے انہی مزاروں پر بیٹھ کر آزمایا۔ پیروں فقیروں کے چرنوں میں سیس نوایا' لیکن دل کا قرار جو کھو گیا تو پھر نہ ملا۔

میرے دل میں دستکوں کا شور گونجتا تھا۔ ان گنت دستکیں۔ وہ ساری دستکیں جو میں نہیں دے سکا تھا۔ میں نے اس شور سے نجات پانے کی خواہش میں خود دستکیں دینا شروع کیں اور مجھے استاد رحمتا جیسا استاد ملا جو دستکیں دینے کے فن میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ میرے دل کو چین گو تب بھی نہ آیا لیکن ایک آس تو بندھی۔ ایک راستہ تو سجھائی دیا۔ ایک آسرا تو ملا۔

چھوٹے بڑے، نئے پرانے، رنگ برنگے بوہے میں نے کھٹکھٹائے۔ میں دستک دے کر آگے گزر جاتا۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھتا۔ چاہے کوئی لاکھ بلائے۔ ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا تھا تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ بس تبھی یہ ہوا کہ کلیجے میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھیں اور اتنی پیڑ ہوئی کہ لگا میں مر ہی جاؤں گا۔ پر میں بچ گیا۔

''میری پیڑ کا علاج کیا ہے۔'' میں نے استاد رحمت سے دست بستہ عرض کی تو وہ بولے ''کون جانتا ہے۔ جب تک پھل پک نہ جائے' اسے شاخ کی سولی پر ٹنگا رہنا پڑتا ہے۔''

''کچھ تو حل ہوگا اس کا۔ آخر کب تک۔'' مجھ سے اکثر یہ پیڑ' یہ کرب' یہ بے چینی برداشت نہیں ہوتی۔ سینہ دھونکنی کی طرح بجتا ہے۔

''ہمارے پلے کچھ نہیں ہوتا چن میریا سوائے انتظار کے۔ انتظار اس بوہے کا جسے ہمارا انتظار ہو۔'' لیکن انتظار کا بار مجھ سے کبھی کچھ سے اٹھایا نہ گیا۔

ہنی پان شاپ کے برابر رفیق واچ ہاؤس کا تھڑا میرے بے کار دنوں کی آماجگاہ ہے۔ دکان تو جانے کب سے بند ہے اور کیا پتہ کب تک بند رہے۔ مجھے تو اپنی توڑ جھائی ہے، مجھے اس سے کیا۔ میں سر جھکائے اکڑوں بیٹھا رہتا ہوں اور میرے سر کے دراز بال میرے چہرے کو چھپائے رکھتے ہیں۔ سردیاں ہوں یا گرمیاں، میرا ٹھکانہ نہیں بدلتا۔ دھوپ میرا بدن جلاتی ہے، سرد ہوا اسے یخ کر دیتی ہے۔ میری ہڈیاں اکڑ کر تڑخنے لگتی ہیں۔ نیند کی تتلیاں میری آنکھوں کے گرد منڈلاتی ہیں۔ میں نیند کے نشے میں مست رہتا ہوں۔ پر سوتا نہیں ہوں۔ مجھے ہر وقت چوکس رہنا ہے۔

گرمیاں ختم ہوتی ہیں تو سردیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ سردیوں کے بعد پھر سے گرمیاں آ جاتی ہیں اور ان کے بعد پھر سے سردیاں۔ موسم بدلتے ہیں۔ عمر گزرتی جاتی ہے۔ اور اگر کچھ نہیں گزرتا یا ختم ہوتا تو وہ انتظار کی گھڑی ہے۔ انتظار کا سانپ بس سے بھرے ہوئے دانت میرے اندر

کھو تا ہے۔ مجھے ڈستا ہے۔ اس کا زہر میرے خون میں شرائے بھرتا ہے تو میں تھڑے سے اتر آتا ہوں۔

سامنے بازار ہے تا حد نظر تک پھیلا ہوا۔ اور اس بازار میں لوگ ہیں' بے انت۔ لوگوں کی بھیڑ مجھے روکتی ہے۔ لیکن میں سانس لینے کو بھی نہیں رکتا۔ اس بھیڑ کو چیرتا ہوا بھاگتا ہوں۔ بار بار ٹھوکر کھاتا اور ڈھے جاتا ہوں۔ پر ہار نہیں مانتا۔ اٹھ کر پھر سے بھاگنے لگتا ہوں۔ میرے اندر لگی آگ مجھے پل پل جلاتی ہے اور کہیں مجھے چین نہیں لینے دیتی۔ تب مجھے اور کوئی راہ نہیں سجھائی دیتی سوائے اس کے کہ میں بوہے کھڑکا تا جاؤں۔

شروع میں بہت مسئلہ ہوتا تھا۔ ویسے دیکھو تو کتنا سوکھا لگتا ہے یہ کام۔ لیکن یہ ایسا ہے نہیں۔ دھیرے دھیرے میں بوہوں کی بولیاں سمجھنے لگا تو میری مشکل اور بڑھ گئی۔ میں کسی گلی میں سے گزرتا تو ایک ساتھ کتنے بوہوں کی سمت کھنچتا جاتا۔ بوہے مجھے اپنی اور بلاتے تو میرے لیے خود کو روکنا میرے بس میں نہ رہتا۔ میرا دماغ دستکوں کے شور سے پھٹنے کو ہوتا اور میرا دل تیز تیز دھڑکتا۔ یوں لگتا جیسے ابھی یہ دھڑکنا بند کر دے گا اور میرا سانس رک جائے گا۔ میں پاگلوں کی طرح کبھی اس بوہے کی طرف بھاگتا، کبھی اُس بوہے کی طرف۔ میرا ہاتھ دستکیں دے دے کر چھل جاتا۔ میں گندے پانی کی نالیوں میں اوندھے منہ جا گرتا۔ دیواروں سے ٹکراتا۔ تھڑے سے الٹ جاتا۔ ہر بوہے پر مجھے حاضری دینی پڑتی اور میں تھک کر چور ہو جاتا۔

کیوں کچھ بوہے بلاتے ہیں، اور کچھ نہیں؟ یو ہا تو پھر بھی نہیں کھلتا۔ بھاویں لاکھ ہاتھ مارو۔ ایسے بوہے پر دستک دینے کا فائدہ؟ پھر کیوں وہ میری راہ کھوٹی کرتا ہے؟ کیا چاہتا ہے مجھ سے؟ عجیب گھمن گھیری سی سوچوں کی میرے دماغ میں چلتی رہتی۔

تب استاد رحمتا صاحب نے آ کر میری بانہہ پکڑی اور یہ منزل پار کرائی۔ ورنہ کیا پتہ میں یہیں فنا ہو جاتا۔ یہیں ساری عمر گھال دیتا۔ انہوں نے فرمایا'' ہم نہیں بوہا ہمارا انتخاب کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کس سے پردہ کرنا ہے، کس کو سامنے آ کر اشارے سے اپنی طرف بلانا ہے۔ کب کون سا بوہا کھل جائے، کون جانے۔''

کتنے ہی بوہے تھے، مجھے تو ان کی گنتی بھی یاد نہیں رہی، جن پر میں نے دستکیں دیں۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ کتنا وقت گزر گیا، اس کام میں۔ لیکن وہ پیڑ جو کلیجے میں اٹھتی تھی، اب بھی ویسی ہے۔

تب ایک دن۔۔۔۔۔۔۔

مجھے یاد نہیں ہے وہ کون سی گلی تھی۔ کوچہ لون والا تھا، یا کوچہ چابک سواراں، یا اچی گلی۔ اور بوہے کا رنگ کیا تھا، کچھ بھی یاد نہیں۔ میں نے خود کو اس بوہے کے بالکل سامنے کھڑا پایا تھا۔ بس اتنی دوری پر کہ ہاتھ بڑھاؤں اور اسے چھو لوں۔ مجھے یاد ہے اس پر تازہ روغن ہوا تھا کہ لگتا اسے چھوا تو رنگ انگلیوں کی پوروں پر اتر آئے گا۔ میرا داہنا ہاتھ اٹھا اور میں نے پہلی دستک دی۔ تبھی میرے دل کی دھڑکن مدھم ہوئی۔ دستک کی آواز میرے اندر ہی کہیں بہت زور سے گونجی۔ باہر ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ پتہ نہیں باہر کچھ تھا بھی کہ نہیں اندر ہی اندر شور برپا تھا۔

دستک کی لہر پھیلی، اور پھیلتی چلی گئی، جیسے چانن پھیلتا ہے یا خوشبو پھیلتی ہے۔ ایسا چانن جو اندھا کر دے، اور ایسی خوشبو جو سانس گھونٹ دے اور بس تبھی بوہا کھلا۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا میرے چہرے سے آ کر ٹکرایا۔ اس جھونکے میں نمی تھی کسی دور دراز جگہ ہونے والی بارش کی نمی۔ میں نے

ایک قدم آگے بڑھایا، دہلیز کے اس پار اور یوں لگا جیسے کوئی مجھ میں سے نکل کر آگے بڑھا ہو۔ میں یہیں کھڑا اسے تک رہا تھا، اور میں ہی بوہے کے اس طرف ایک لمبے راستے پر چل رہا تھا، جس کے ہر طرف دودھیا روشنی تھی، اور دھوپ تھی سردیوں کی دوپہروں اور کسی حسینہ کے بالوں کی چھاؤں جیسی ٹھنڈی' اور سرسراہٹیں تھیں، پتوں میں سے ہوا کے گزرنے کی، اور آہٹیں تھیں انجانے لوگوں کے قدموں کی، اور سرگوشیاں تھیں نرم لہجے میں بات کرنے والی لڑکیوں کی جو بتا رہی تھیں کہ وہ گھڑی ضرور آئے گی۔ جب میرے دل کے بند کواڑوں پر دستک ہو گی۔ اس کے پٹ کھل جائیں گے اور میں آزاد ہو جاؤں گا۔

اُردو تنقید کا اصلی چہرہ

اردو تنقید کا اصلی چہرہ عارفہ صبح خان کا ایم فل کے لیے لکھا گیا ایک تحقیقی مقالہ ہے اور اس میں درج ذیل ابواب/موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ موضوع کا تعارف، مفروضات...... تحدید بندی، زیرِ تحقیق موضوع کی اہمیت، تنقید کی داغ بیل، ابتدائی تنقید کے نقوش، تنقید کے معانی و مقاصد، تنقید کی اقسام، تنقید کے بنیادی اصول، نقاد کا منصب، اردو تنقید کا آغاز و ارتقاء، اردو تنقید کا وجود، اردو تنقید کا منبع و ماخذ، اردو تنقید کے عناصر خمسہ، مولانا حالی...... اردو تنقید کے بانی، اردو تنقید کا چلن، اردو تنقید کا عبوری دور، عبوری تنقید کے سات برج، اردو تنقید انگریزی کے زیر اثر، اُردو تنقید کے دبستانوں پر تنقید، دبستان کی اصطلاح، ضرورت و اہمیت، تنقید کے مختلف طبقہ ہائے فکر، تنقیدی دبستانوں کی اقسام، عمرانی تنقید، تاثراتی تنقید، جمالیاتی تنقید، تاریخی تنقید، نفسیاتی تنقید، رومانی تنقید، مارکسی تنقید، تقابلی تنقید، تشریحی تنقید، اسلوبیاتی تنقید، ہیئتی تنقید، ساختیاتی تنقید، آرکی ٹائپل تنقید، تنقید کی منزلیں، ہندوستان میں تقسیم سے پہلے اور بعد کی تنقید، آزادی کے بعد پاکستان میں تنقید، اردو نقادوں کے رویے اور رجحانات، میراجی...... پیکر خاک میں لطیف روح اور تنقیدی ذہن، اختر حسین رائے پوری...... ادب، انقلاب اور ترقی پسندی کا داعی، محمد حسن عسکری...... نظریات پر نظر رکھنے والا مباحث کا خوگر!! کلیم الدین احمد...... مغربی تیشہ سے مشرقی ادب کھودنے والا، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی...... تنظیمی و تخلیقی اصولوں کا خالق، پروفیسر جیلانی کامران...... جدید اور قدیم علوم کے سنگم پر تنقید، ڈاکٹر وحید قریشی...... تنقید و تحقیق کا بہتا ہوا سرچشمہ، ڈاکٹر وزیر آغا...... سائنسی نقطۂ نظر اور نئے زاویے تراشنے والا، ڈاکٹر سلیم اختر...... نباض، نکتہ رس، دیدہ ور، نفسیات پسند، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ...... جدید ترین تنقید کا متعارف کنندہ، جدید ترین تنقید پر تنقیدی نشانات، ساختیات کی تعریف اور مباحث، پس ساختیات اور اس کے ادوار، تشکیل رد تشکیل، لسانیات اور شعریات، جدیدیت اور مابعد جدیدیت، تنقید...... حدود و امکانات، معیاری ادبی تنقید کی ضرورت، کیا اردو تنقید عالمی معیار پر پرکھی جا سکتی ہے؟ اردو تنقید اکیسویں صدی میں، کیا تنقید سائنس ہے......؟؟؟ اردو تنقید کا جائزہ اور نتائج

انکار

اتنا بڑا کوئی آدھے کلو کا پتھر تو ہوگا۔ اٹھا کر دے مارا۔ کوئی اپنی جان سے جاتا۔ ان کی بلا سے۔

تمہیں اچھی طرح پتہ ہے دوپہر کو جب درخت کا سایہ باقی نہیں رہتا، یہ چاروں لفنگر پرے پلی پر سے نمودار ہوتے ہیں اور تمہارے قریب سے گزر کر ادھر بستی قاسم علی میں چلے جاتے ہیں۔ بس یہی وقت ہوتا ہے محتاط رہنے کا۔

پتھر لگنے کے بعد جیسے تم منہ بھار آگے جا پڑے تھے، میں تو یہی سمجھا کہ بس گئے کام سے۔ لیکن ٹل گئی آئی ہوئی۔ کیسے ہر شے تھم جاتی ہے، بندے کے آل دوالے کبھی کبھار۔ جیسے کوئی سانس روک لے۔ فطرت اگر سانس لیتی ہے تو سمجھو تب اس نے روک لیا تھا اسے۔ تم نے سر ہلایا، تو میری جان میں جان آئی۔

اور یہ کیسے مسخروں کی طرح دانت نکال کر ہنس رہے ہیں جیسے بڑا کارنامہ کیا ہو کسی کو تکلیف دے کر۔ یہی سکھاتے ہیں کیا سکول میں ان کو الو کے چرخے۔ عمریں دیکھو ان کی۔ ایسی نرمی ہے چہرے پر کہ لڑکیوں جیسے نازک سے لگتے ہیں۔ نہ داڑھی نہ مونچھ۔ سولہ سولہ سال کے سن لیکن حرکتیں اول درجے کے شہدوں جیسی۔

میرا پوچھو تو ایک دھیلے کا اعتبار نہیں ہے مجھے انسانوں پر۔ آخر ہے کیا یہ انسان۔ بدبودار نطفے کی پیداوار، سرشت اس کی ہے تو وہی گندگی سے لبریز، سڑک پر تیز رو ٹریفک سے فضا میں کچھ دیر کے لیے بلند ہونے والی گرد راہ سے زیادہ حقیر اور پرے نشیبی علاقے میں مدتوں سے پڑے غلاظت کے ڈھیروں سے اٹھتے تعفن سے زیادہ کراہت انگیز بو بکھیرتے ہوئے رذیل فانی وجود، ان کی وقعت ہی کیا ہے۔ فطرت کے لامتناہی، متنوع اور بے پناہ نظام میں، ریگستان کے ایک ذرے سے کہیں کم تر اور سمندر کے ایک قطرے سے زیادہ بے مایہ۔ میں ان سے تمہاری ہر دم چمکی رہنے والی سفاک بھوک سے زیادہ نفرت کرتا ہوں۔

مجھے مت بتاؤ۔ میں جانتا ہوں۔ یہ بھوک، یہ ازلی بھوک جو ایک زہریلے کیڑے کی طرح تمہاری انتڑیوں کو اندر ہی اندر کاٹتی، ڈستی اور نوچتی رہتی ہے، تمہیں کتنی اذیت دیتی ہے۔ اور کیسے یہ بھوک بڑھتی ہی گئی ہے، ان سالوں میں۔ اوہ میرے خدایا۔ کیسے چمکتی ہے یہ بھوک کہ آنکھیں نہیں ملائی جاتیں اس سے۔ سانس کھینچ لیتی ہے تمہارا۔

تمہیں یاد ہے کیسے یہاں حد نظر تک لہلہاتے کھیت تھے۔ پرے جہاں مسجد کے مینار نظر آتے ہیں ڈھوک کھلو تک جو سو پچاس گھروں سے زیادہ کی بستی نہیں تھی۔ اور کوئی پکا راستہ ہی نہیں تھا وہاں پہنچنے تک۔ کچی پگڈنڈیاں بنی ہوئی تھیں۔ اور یہ سڑک بھی کہاں پکی تھی۔ گرد کے بادل شرارتی بچوں کی طرح یہاں پیدل چلنے والوں کا بھی پیچھا کرتے اور اگر کوئی ریڑھ یا ٹرالا گزرتا تو جیسے غصے میں آجاتے' اور دیر دیر تک منہ پھلائے ہوا میں جھولتے تھے۔

ڈھوک کھلو سے پرے باغات تھے۔ ٹینڈوں والے کنویں تھے' اور ایک چکی تھی جو سارا سارا دن جانے کس کی یاد میں کوکتی رہتی۔ اور فلک کو چھونے کی آرزو میں دیوانے ہوئے جاتے درخت تھے' اور تازہ ہوا تھی جو بہشت سے آتی معلوم ہوتی۔ لیکن کوئی زہر انسانی فطرت سے زیادہ مہلک ہے بھلا۔ ان کھیتوں اور باغوں کو بستیوں سے ڈھانپ دیا انہوں نے۔ اور سڑکیں بچھا دیں کولتار والی، اور درخت کاٹ کر زمین کا سینہ ننگا کر دیا۔ نہ وہ کچے راستے رہے' نہ وہ گرد کے بادل' اور نہ آنکھوں کی آزمائش لیتا ہوا پرے آفاق تک پھیلا کھیتوں اور باغوں کا منظر۔ یہ ہے انسانی فطرت، تباہ کن، شرانگیز اور فتنہ پرداز۔

لیکن پتہ بھی تو چلے کہ کون ہے اصل دشمن۔ ایک جیسے چہرے ہیں ان سب کے۔ شناخت ہی نہیں ہو پاتی۔ لوگ بدلتے ہیں۔ وقت بدل جاتا ہے۔ منظر وہ نہیں رہتے اور فضا مسموم ہوئی جاتی ہے لیکن نہیں بدلتا تو یہ انسان، اور اس کی فطرت۔ ابھی بچے بھاگتے پھرتے ہیں، ابھی یہ جوان ہو کر اور بچوں کو پیدا کرنے لگ جاتے ہیں۔ پہلی گندگی صاف نہیں ہو پاتی کہ اس میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تمہاری بھوک میں بھی۔ غیر آسودہ، سفاک اور مسلسل بھوک۔

میں جانتا ہوں۔ سب دکھائی دیتا ہے کہ کیسے بھوک سے تم بے چین ہو جاتے ہو، تڑپتے ہو اور زمین پر ایڑیاں رگڑتے ہو لیکن کوئی چشمہ نہیں پھوٹتا ماں کے سینے سے۔ تو تم گھاس اور پتے کھاتے ہو۔ درخت کے چھال پر دانت مارتے ہو۔ گیلی مٹی چبا جاتے ہو اور پرے نشیب میں گندگی کے ڈھیروں سے پچوڑی ہوئی ہڈیاں چباتے، چکنائی سے بھرے کاغذ چاٹتے، اور بارش کے پانی سے بنے کیچڑ کو پی جاتے ہو۔ پر تمہاری بھوک نہیں مٹتی۔

مجھے یاد ہے' بالکل صاف صاف وہ دن جب تمہیں بستی سے نکالا گیا تھا۔ کیسا قہر ڈھایا تھا انہوں نے تم پر۔ اے خدا آسمان کا سینہ کیوں شق نہیں ہوا اس دن اس ظلم کو دیکھ کر۔ تمہارا جسم لہولہان تھا ان کے برسائے گئے پتھروں سے' اور روح گھائل تھی۔ اور پیٹ میں بھوک کا الاؤ بھڑکا ہوا تھا جو ہر شے کو جلا رہا تھا۔ ہر شے کو' تمہاری بھوک سہنے کی شکتی' اور پوری انسانیت اور خود اپنے آپ پر تمہارے یقین کو۔ آخر تمہارا قصور ہی کیا تھا۔ گوشت کیا وہ نہیں کھاتے' دوسروں کو مار کر۔ تم نے مردہ اور سڑانڈ دیتے ہوئے جانوروں کا گوشت کھا لیا تو۔۔۔ جانے کیوں انہیں اتنی اذیت ہوئی اس بات سے' جیسے تم نے ان کی کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اور انہوں نے تمہیں بستی سے باہر لا پٹخا' اپنے ہی زخموں سے رستی پیپ کو چاٹنے اور ان پر آنے والے کھرنڈ کو چبا کر زندگی کے بجھتے ہوئے الاؤ میں کوئی ایک چنگاری بھڑکائے رکھنے کی ناکام کوشش کئے جانے کے لیے۔

لیکن تم فکر کیوں کرتے ہو۔ تم فطرت کے بیٹے ہو۔ چیونٹیاں تمہارے جسم کو سہلاتی ہیں اپنے دانتوں سے۔ گرد اسے شفا دیتی ہے۔ بارش تمہیں نہلانے آتی ہے اور درخت نے اپنی چھاؤں تم پر دراز کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ تم اس مٹی سے جنمے ہو۔ یہی تمہاری سیوا بھی کرتی ہے اور حفاظت بھی' اور ایک دن یہی تمہیں سب کے نظروں سے چھپا کر اپنی آغوش میں لے گی۔ تم اسی سے ابھرے ہو، اس میں جا سوؤ گے۔

میرے دوست صبر کا دامن اپنے ہاتھوں سے سرکنے نہ دو۔ امید کی ڈور کو تھامے رکھو کہ ایک دن تمہارا بھی آئے گا۔ اس دھرتی پر اگنے والی خوراک پر ہر مخلوق کا حق اور اس میں اس کا حصہ ہے۔ تمہارا حصہ تمہیں ملے گا۔ یہ بھوک کے کیڑے جو پیٹ کے زیریں حصوں میں کلبلاتے اور انتڑیوں

کو کاٹتے ہیں، یہ باقی رہنے کے لیے نہیں ہیں۔ سمجھو تو یہ تمہارے صبر کا امتحان ہیں۔ تمہارے نفس کی آزمائش ہیں۔ ان کے سامنے ہار مت مانو۔

مجھ سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں یہ آزمائش طویل ہو چکی ہے۔ تمہارے صبر کی حد سے کہیں آگے تک پھیلی ہوئی۔ اس مسلسل آزمائش نے تمہاری ہڈیوں کو اندر سے کھوکھلا' جسم کے اعصاب کو ناکارہ اور تمہارے حواس کو مختل کر دیا ہے۔ گیلی مٹی، گھاس، پتے اور چھال بھی اب تمہاری زندگی کے بجھتے ہوئے الاؤ میں ایندھن نہیں بن پاتے۔

لیکن ایسی بھی کیا مایوسی کہ انسان اپنے اطراف سے آنکھیں بند کر لے اور یہ بھی نہ دیکھ سکے کہ ایک ننھی پیاری بچی اس کے دوار پے کھڑی ہے۔ زرا دیکھو تو یہ مصری کی ڈلی' گلاب جامن سی بچی بیٹھی کیسے پیار اور حیرت بھری نظروں سے تمہاری اور دیکھ رہی ہے۔ کیسی میٹھی اور شیرے جیسی معصومیت اس کے چہرے سے چھلک رہی ہے جیسے پھل پک جائے تو اس میں سے مٹھاس رسنے لگتی ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں چمک ہے، تیز مرچوں والی چاٹ جیسی، جس کا سوچ کر ہی تمہارے تن بدن میں زندگی کی حرارت بیدار ہوئی ہے۔

یہ ضرور پلی کے پرے موجود کار کے پاس کھڑے مرد کی کچھ لگتی ہوگی جو گاڑی کا بونٹ کھولے انجن کا معائنہ کرنے میں منہمک ہے اور اسے ذرا بھی خبر نہیں کہ اس کی بچی چھوٹے چھوٹے قدموں سے بھاگتی ایک پھدکتے مینڈک کے پیچھے پیچھے کتنی دور پیپل کے درخت کے قریب چلی آئی ہے اور اب تھک کر گھاس پر بیٹھی خاموشی سے تمہیں یوں تک رہی ہے، جیسے تمہیں جانتی ہو۔ یا مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ تم اس سے پہلے بھی مل چکے ہو۔ کیا واقعی یہ بچی ان دونوں کی کچھ لگتی ہے یا۔۔۔۔۔

''ادھر آؤ۔ میرے پاس۔ پیاری بچی۔'' لیکن یہ تو کچھ سنتی ہی نہیں۔ ''ارے آتی کیوں نہیں۔ ڈرتی ہو کیا۔ مجھ سے مت ڈرو۔ میں تمہیں لوری سناؤں گا۔ اپنے کندھے پر اٹھاؤں گا۔ تمہیں جھلاؤں گا اور تم سو جاؤ گی۔ میٹھی اور پیاری نیند۔''

بس ٹکر ٹکر تکے جاتی ہے۔ اس کے منہ میں کچھ ہے۔ ضرور مٹی کھا رہی ہے۔ نرم اور گیلی سی مٹی۔ بالکل میری طرح بھوکی ہوگی۔ پر اسے کیا پتہ بھوک کیا ہوتی ہے۔ اتنی چھوٹی سی تو ہے۔ ''ادھر آؤ۔ میری بچی۔ میری پیاری بچی۔ کیا تم خوفزدہ ہو۔ پر کس سے۔''

اس سے پہلے کہ پرے کھڑا مرد بچی کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھے اور اسے ڈھونڈتا ہوا اس درخت کی طرف چلا آئے اور پھر اسے لے کر چلتا بنے' تم اسے یہیں کہیں چھپا لو۔

اے خدا اسے ہمت دے۔ اس کا جسم بھوک کے بوجھ سے نڈھال ہے اور اس کے لیے ایک قدم اٹھانا بھی دوبھر ہے۔ اسے اتنا حوصلہ دے کہ یہ خود کو اس بچی تک پہنچا سکے۔ اسے یقین دلا سکے کہ یہ اس کا دوست ہے۔ ان کا جنم جنمانتر کا رشتہ ہے۔ ایک ان لکھا تعلق، جسے بس محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ اسے اپنے تعلق کی حدت سے گرمائے گا۔ اسے لبھائے گا اور اپنے ساتھ چلنے پر، ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ رہنے پر آمادہ کر لے گا۔

یہ اس کی تنہائی کے اندھیرے میں قربت کی لو بھڑکائے گی اور ہر شے اجال دے گی۔ یہ اسے ایک پائمال وجود کی طرح بے دست و پا فنا ہونے نہیں دے گی۔ اسے بکھرنے سے بچا لے گی۔ اس کی ڈھال بنے گی۔ اسے جانے مت دو۔ کسی کو اسے خود سے چھیننے مت دو۔ اے خدا اسے طاقت دے اپنے آپ کو فنا ہو جانے سے بچا لینے کی۔

بچی اٹھ کھڑی ہوئی ہے، تو ضرور یہ تمہاری طرف بڑھے گی۔ تمہاری بے تابیوں کی شدت نے اسے جھنجھوڑا ہوگا اور اس نے اپنا فیصلہ تمہارے حق میں دیا ہوگا۔ لیکن یہ تو واپس اسی طرف چل پڑی ہے جدھر اس کا باپ کھڑا اب تک گاڑی کے انجن میں الجھا ہوا ہے۔

اسے روکنا ہوگا۔ بس تھوڑی سی ہمت کرو۔ اٹھو۔ چلو۔ اور آگے بڑھو۔ تیز چلو۔ قدم لمبے لمبے اٹھاؤ۔ ادھر ادھر مت دیکھو۔ بس چند قدم اور۔ ستانے کا وقت نہیں ہے۔ تمہاری حد درخت کی حد سے متجاوز نہیں ہے۔ اسے اس حد سے باہر مت نکلنے دو۔ بس جھپٹ پڑو۔ ہاں اسی طرح۔ اسے گرالو۔ اس کے منہ پر ہاتھ رکھو۔ اس کی رونے کی آواز دور نہیں جانی چاہیے۔ اس کے باپ، یا کسی بھی باپ کے کانوں تک نہیں پہنچنی چاہیے۔

یونہی آہستہ آہستہ اسے گھسیٹتے ہوئے ادھر لے آؤ۔ درخت کے اس طرف۔ اور ادھر۔ جھاڑیوں کے درمیان، جہاں کتنی ہی جگہ تم نے اپنے چھپنے کے لیے بنائی ہوئی ہے، بس وہیں لے آؤ۔ ہمیشہ اسے تھوڑی ہی رکھنا ہے وہاں۔ بس اتنی دیر، جب تک کہ وہ شخص اسے تلاش کرنے کی ناکام کوشش کے بعد تھک ہار کر لوٹ نہیں جاتا اور جب تک وہ یہ نہیں سمجھ لیتا کہ اپنی بچی کو تلاش کرنے کے لیے یہاں آنا بے کار ہے۔

زور سے پکڑنا تھا الو کے کان۔ ایک بچی کو قابو میں نہیں رکھ سکے۔ اچھلو۔ اس پر گر جاؤ۔ چوٹ لگتی ہے تو لگنے دو۔ پرواہ مت کرو۔ جیسے مچھلی پکڑتے ہیں دونوں ہاتھوں سے۔ گیدڑ جھپٹتا ہے خرگوش پر۔ جیسے انسان دوسرے انسان کو اپنے بس میں کرتا ہے۔ بس ایسے ہی اسے جکڑ لو۔ اسے گھسیٹو۔ چیختی ہے تو اس کے منہ بند کر دیا گردن میں دانت کھبو دو۔ آواز کا منبع تو آخر وہیں ہے۔ کاٹتے جاؤ۔ تیزی سے، زور لگا کر۔

ہچکچاؤ مت۔ بس پیتے جاؤ یہ گرم اور نمکین سا محلول۔ یہ تمہاری زندگی کے بجھتے ہوئے الاؤ میں پھر سے لو بڑھائے گا۔ پیتے جاؤ کہ تمہارے لیے اسی میں شفا بھی ہے اور حیات بھی۔ یہی تمہاری بھوک کا علاج بھی ہے اور فنا ہو کر بکھر جانے سے تمہارا انکار بھی۔

دائرہ

گھر میں ابا کی کرسی میری سب سے محبوب شے تھی جس پر بیٹھ کر وہ چلم پیا کرتا تھا۔ میں چلم تو نہ پیتا لیکن اس کی طرح پیر اوپر چڑھا کر کرسی پر بیٹھا رہتا۔ یہ صحن کے ایسے کونے میں پڑی تھی جہاں سردیاں گرمیاں دھوپ نہ آتی۔ وہ ہمیشہ اس سے ایک فٹ پرے ہی ٹہلتی رہتی۔ کرسی پر بیٹھنے سے جو منظر سامنے دکھائی دیتا اس میں نیم کے پیڑ کے علاوہ جو میرے ابا کے بقول ہمیشہ سے یہاں ایستادہ تھا' اور کوئی قابل ذکر شے موجود نہیں تھی۔

ابا بتایا کرتا تھا کہ کبھی نیم کے پیڑ بستی کے ہر گھر میں موجود تھے۔ کتنی عجیب بات تھی کہ ہر گھر کا صحن ایک ہی منظر پیش کرے۔ لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ بلکہ سرے سے کوئی پیڑ بستی میں باقی نہیں بچا تھا حتی کہ پارکوں میں بھی نہیں۔ ابا کہتا تھا کہ پیڑ نہ رہیں تو پیڑوں والے گھروں میں اتر آتے ہیں اور یہ اچھا نہیں ہوتا۔ پتہ نہیں کیوں ابا کی اکثر باتیں مجھے بے سروپا لگتی تھیں۔ مثلاً ابا کہتا کہ ہمارا گھر بستی کے مرکز میں تھا۔ یہ ہے کوئی ماننے کے لائق بات۔ یا پھر وہ کہتا کہ ہمارا گھر بستی کے سب سے اونچے ٹیلے پر ہے۔ بالکل ہی ناقابل یقین۔ ٹیلا ہی نہیں ہے کوئی، اونچے نیچے ٹیلے کی تو بات ہی اور ہے۔

ایک رات میں دیر تک باہر سڑکوں پر مٹر گشت کرتا رہا۔ بس ایسے ہی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ابا کے جوڑے مجھے پورے آنے لگے تھے۔ دو تین جوڑے تھے اور میری تو ضرورت سے زیادہ ہی تھے۔ گھر لوٹا تو مجھے صحن پورے چاند کی روشنی میں نہایا اور پتوں اور ٹوٹی ہوئی ننھی شاخوں سے اٹا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ لگتا تھا ایک سے زیادہ بندر تھے جنہوں نے اس کی یہ درگت بنائی تھی۔ لیکن بستی میں بندروں کا کیا گزر۔ پرے ویران علاقوں میں البتہ ان کے بارے میں سننے میں آتا تھا کہ وہاں یہ کافی زیادہ تھے۔ مجھے لگا کہ کوئی بندر ہنوز شاخوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ شاخوں میں ہلچل ہوئی تھی۔ میں نے بہت دیکھا لیکن مجھے کچھ نظر نہ آیا۔

میں نے درخت کے تنے کو بازوؤں کے حلقے میں لیا اور پیر اسکی ایک گانٹھ پر جمایا۔ شروع میں کچھ مشکل ہوئی لیکن پھر میں ایسی آسانی سے اس کی بلندی پر پہنچ گیا جس کی مجھے یکسر توقع نہیں تھی۔ وہاں بندر تو کوئی نہیں تھا لیکن ایک اور شے بہت کام کی مجھے دریافت ہوئی۔ بلندی پر موجود شاخوں کے درمیان ایسی جگہ بنی ہوئی تھی جو بیٹھنے کا استھان معلوم ہوتی تھی۔ میں چوکڑی مار کر وہاں بیٹھا گیا۔ عجیب خاموشی اور ہوا کی مدھ بھر سرسراہٹ سے وہ جگہ لبریز تھی۔ میں نے سوچا باہر والوں کے لیے میں گھر کے اندر ہوں۔ لیکن اصل میں ایسا نہیں ہے۔ جو مجھے گھر میں تلاش کرنے آئیں گے ان کے لیے میں گھر سے باہر ہوں۔ جبکہ اصل میں ایسا بھی نہیں ہے۔ سو یوں میں کہیں بھی نہیں ہوں۔ یہ دلچسپ کھیل تھا۔ اگلے دن میں اپنے ساتھ ایک دری بھی لیتا گیا۔ یوں میری 'شجر بسری' کے معمول کا آغاز ہوا۔

بس ایک طرح کا تلذذ تھا وہاں رہنے میں۔ یوں تو گھر میں بھی تنہائی اور خاموشی میسر تھی لیکن گھر میں کچھ کیے بغیر ہاتھ پر ہاتھ دھرے

خاموش بیٹھے رہنے کو کبھی جی نہیں کیا' جبکہ یہاں کچھ کرنے ہی کی خواہش پیدا نہیں ہوتی تھی۔ خاموش بیٹھے ہوئے، شاخوں کے درمیان میں سے دکھائی دینے والے مبہم مناظر میں کچھ ایسی بات تھی جس نے مجھے کیل دیا تھا۔

غیر معلوم منبعوں سے دبے پاؤں آتا سرگوشیوں جیسا مدہم شور، پتوں سے چھو کر بہتی ہوئی ہوا کی نرم سرسراہٹیں اور خود میرے اندر سے سر اٹھاتی آوازیں مجھ پر ایسے بھید آشکار کرتی تھیں جو میرے لیے ناقابل یقین تھے، اور جنہیں سمجھنے سے بہت پہلے ہی میں ان کے سحر میں گرفتار ہو جاتا اور مجھے لگتا میرا سانس گھٹ جائے گا۔

وہاں بیٹھے ہوئے مجھے کچھ بھی یاد نہ آتا۔ دل کی دھڑکن بھی سنائی نہ دیتی اور سانس یوں دبے پاؤں چلتا جیسے کوئی نہایت خفیہ سرگرمی کر رہا ہو۔ آنکھ جھپکنے کا بھی خیال نہ آتا اور میں ہونے اور نہ ہونے کی کیفیت میں یا ان دونوں کیفیات کے درمیان کسی سرحد پر ڈولتا رہتا۔ کبھی لگتا کہ ہوں کبھی لگتا کہ نہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔

میری ماں مجھے پیدا کرنے کے تھوڑی ہی دیر بعد چل بسی تھی۔ میں نے ابھی پوری طرح سانس لینا بھی نہیں سیکھا تھا کہ اسے آخری ہچکی آئی اور وہ مجھے میرے باپ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر ایک نئے سفر پر نکل کھڑی ہوئی۔ جیسے ہم دونوں کوئی ایسا کھیل کھیل رہے ہوں جس میں دونوں کھلاڑی ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کیے رہتے ہیں اور پھر ہر ایک اپنی ناک کی سیدھ میں چلنے لگتا ہے۔ میں نے تو اس کی، اور یقیناً میری ماں نے بھی میری صورت نہیں دیکھی تھی۔ اگر ہم کہیں مل بھی جائیں اور کیا بعید ہے کہ ایسا ہوا بھی ہو تو شاید ایک دوسرے کو نہ پہچان پائیں۔

میرا نام شب بیدار یا مخبوط الحواس دیوانہ نہیں ہے جیسا کہ بستی والے مجھے پکارتے ہوں گے۔ بس میں ان جیسا نہیں ہوں۔

میرا نام ارشاد یا شاید دلشاد یا۔۔۔ خیر نام کچھ بھی ہو۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بستی والے مجھے ہمیشہ 'ٹھلا' ہی پکارتے تھے۔ وہ اپنی تمام تر ابتلاؤں کی وجہ بھی مجھے ہی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ میں ایک مدت سے ان سے علیحدہ زندگی بتا رہا ہوں۔ اگر ہر تھوڑے عرصے بعد وہاں طاعون جیسی وبائیں پھوٹ پڑتی ہیں، زمین اناج اگلنے میں خست کا مظاہرہ کرتی ہے اور ایسی بیماریاں عام ہیں جن کا علاج طب کی کسی کتاب میں نہیں لکھا ہوا تو اس میں میرا کیا قصور۔ میں نے تو، اور اس سے بہت پہلے میرے ابا نے بھی اس کی پیشین گوئی کر دی تھی۔

میرا باپ۔ لیکن ٹھہریے مجھے یاد کرنے دیجیے۔ وہ کون تھا، کیسا دکھتا تھا اور کیا کرتا تھا؟ یہ سوال میرے لیے بہت اہم ہیں، خاص طور پر اس وقت جب کہ میں اس کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ اس نے زندگی میں اتنے کام بدلے کہ مجھے یاد نہیں آتا، ردی بیچنے اور خریدنے کے علاوہ اس نے کیا کچھ کیا۔ اگر فارغ رہنے کو بھی آپ ایک کام مان لیں اور کیوں نہ ہم اسے ایک معقول کام فرض کر لیں تو میں کہوں گا کہ اس کا اصل پیشہ فارغ رہنا ہی تھا، یا جو کچھ بھی اس نے کیا وہ اصل میں اسی خواہش کے تحت تھا کہ اس کے ذمہ کرنے کو کوئی کام نہ بچے۔ کیا آپ کے خیال میں یہ کوئی قابل اعتراض خواہش ہے؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ ہم چاہے کتنے ہی ذمہ دار کیوں نہ ہوں، ہر کام پوری توجہ، لگن اور جانفشانی کے ساتھ صرف اس لیے کرتے ہیں تاکہ اس سے جلد سے جلد چھٹکارا پا لیں اور یوں خود کو زیادہ سے زیادہ کاموں میں الجھائے رکھتے ہیں۔ اگر یہ خواہش نامعقول ہے تو پھر اس رو سے ہم سبھی نامعقول ہیں کیونکہ یہ خواہش تو انسان ہونے کے ناطے ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔

جوکام اپنے ابا کے مجھے یاد ہیں یعنی جو کام اس نے میرے ہوش سنبھالنے سے لے کر خاموشی سے آنے والی اپنی موت تک کیے، ان میں سے ایک تو ردی خریدنے اور بیچنے کا ہے۔ کتابیں، اخبار کے پھٹے ہوئے صفحے، مصنوعات کے ریپر اور لیبل، بوسیدہ مسودے، کرم خوردہ رجسٹر اور فائلیں، کاغذ کے رموں کی کٹائی سے بچنے والی کترنیں اور نجانے کیا کیا الم غلم خریدنے کا اسے شوق تھا، انہیں بیچ دینے کے شوق سے بھی زیادہ شدید۔ ایک سائیکل اس نے اپنے پاس رکھی ہوئی تھی۔ اس کے کیریئر پر دائیں بائیں بڑے بڑے تھیلے لٹکا رکھے تھے۔ صبح خالی تھیلوں کے ساتھ نکلتا۔ جیب میں پیسے رکھ لیتا۔ کوئی دو تین بجے لوٹتا تو جیبیں خالی ہوتیں اور تھیلے بھرے ہوتے۔ پھر پہروں اس ردی کو کھنگالتا۔ جانے اس میں کیا ڈھونڈھتا رہتا۔

وہ روزانہ کام کے لیے نکلتے ہوئے مجھے خالی ڈھنڈار گھر میں اکیلا چھوڑ کر چلا جاتا۔ میں شور مچاتا، لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرتا اور آخر اپنے کھانے اور دوا دارو کا بندوبست کر لیتا۔ خدا ہماری پڑوسن صغراں آپا کی قبر کو ٹھنڈے اور سفید اجالے سے لبالب بھرا رکھے۔ وہی ہمیشہ میری مدد کو آتی۔ اس نے مجھے ایک ماں سے بڑھ کر چاہا اور میں نے بھی ایک بیٹے ہی کی طرح ہمیشہ اس کی مروت اور شفقت کو نظر انداز کیا۔ ہمیشہ کے لیے اپنی جھولی میں چمکتی میل جیسی پچھتاوے کی لیس جما لینے کے لیے۔

گھر میں ایک وہ ہوتا تھا، یا پھر ردی اور برائے نام فرنیچر۔ باورچی خانے کے لیے جگہ تو بنی تھی اور کچھ برتن وغیرہ بھی وہاں موجود تھے جو کبھی میری ماں کے استعمال میں رہے ہوں گے مگر اس کی وفات کے بعد سے ہم نے اسے یکسر فراموش کر دیا۔ کھانا وہ باہر ہی سے خرید کر لاتا۔ خود اکثر کھا کر آتا۔ میرے لیے پلاسٹین کے لفافے میں ڈلوا لاتا۔ مجھے تندور کی روٹی کبھی پسند نہیں آئی۔ نہ ہوٹلوں کا تیز مرچ والا سالن ہی۔ سو میں اس کے آنے سے پہلے ہی صغراں آپا کے ہاں سے کھانا کھا لیتا۔ ساری زندگی اسی طور گزری۔

اپنے باپ کو ہمیشہ گھر میں ہر طرف پڑی ردی کے ڈھیروں میں الجھا ہوا دیکھ کر مجھ پر بھی رفتہ رفتہ ان کاغذوں کے انباروں میں دلچسپی کے کئی پہلو وا ہوئے۔ عجیب عجیب طرح کے رقعے، خط، دستاویزات اور تراشے اس میں سے ملتے۔ ایک بار ایک دستہ ایسے خطوں کا ملا جو کسی لڑکی نے اپنے عاشق کو لکھے تھے اور جن میں اس نے اسے ان تمام عاشقوں کے بارے میں بتایا تھا جو اس سے پہلے اس کی زندگی میں آئے تھے۔

ایسا نہیں ہے کہ مجھے پڑھنے لکھنے کا سودا ہے۔ لیکن ردی کا ڈھیر ہمیشہ میرے تجسس کی لو کو بلند کر دیتا تھا اور کبھی میری اس میں دلچسپی کم نہیں ہوئی۔ میرے لیے یہ بظاہر بے وقعت مگر طرح طرح کی معلومات اور انکشافات سے بھرے ہوئے ردی کے ڈھیر ایک مدرسہ ہی تھے۔

میں نہیں جانتا کب مجھے اپنے آپ لفظوں کے اسرار سے آگاہی ہونے لگی اور وہ تصویروں کی صورت میں اپنے معانی مجھ پر آشکار کرنے لگے۔ یہ سب کچھ ابا کی وفات کے کچھ عرصہ بعد شروع ہوا۔ پتہ نہیں ابا لکھنا جانتا تھا یا نہیں۔ لیکن اسے پڑھتے ہوئے میں نے اکثر دیکھا تھا۔ وہ کاغذوں پر قلم سے نشان بھی لگاتا۔ ان نشان زدہ حصوں کو دیکھ کر مجھے کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر ان کی ابا کے نزدیک کیا اہمیت ہو سکتی تھی۔ کبھی ایک طرح کے صفحات کو دوبارہ پڑھتے ہوئے میں نے اسے نہیں دیکھا۔ سو نشان زد حصوں کی اہمیت اگر اس کے نزدیک کچھ تھی بھی تو وہ فوری نوعیت ہی کی کچھ رہی ہو گی۔ بعد میں وہ کبھی اسے اپنی جانب متوجہ نہیں کر سکے۔

میں بتا رہا تھا یا بتانا چاہتا تھا اور بات کسی اور سمت چل نکلی کہ ابا کے مالی حالات کبھی مستحکم نہیں رہے۔ جب ردی کا کام زیادہ نہ چلا تو اس نے اسے ترک تو نہ کیا، ساتھ ساتھ سامان ڈھونے کا کام بھی شروع کر دیا۔ دن بھر کی محنت سے جو کماتا، اس میں ہم دونوں کی ضرورت جتنے پیسے الگ

کر کے باقی سے وہ ردی خرید لیتا۔ رات کو گھر لوٹتا تو سائیکل کے کیریئر سے لٹکے ہوئے تھیلے بھرے ہوتے۔ ہمارے گھر کا بیشتر حصہ ہمیشہ یعنی تب بھی جب میں اسے بستی والوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلا آیا، ردی کے ڈھیروں سے بھرا ہوا تھا جنہیں اگرچہ میں ایک سے زائد مرتبہ پڑھ چکا تھا مگر انہیں زیادہ سے زیادہ جاننے کی میری حرص کبھی کم کہاں ہوئی تھی۔

ابا اپنے مخصوص چلم کی طرح کے چھوٹے حقے میں سے کش لے کر کھانستا ہوا کبھی کبھار مجھے پڑھتے ہوئے دیکھ کر پوچھتا "کچھ سمجھ بھی آتی ہے۔"

میں انکار میں سر ہلا دیتا اور وہ مطمئن ہو جاتا۔ کتاب کو رٹا جائے تو وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ پاتی۔ یہ ایسا عمل ہے کہ آپ پانی میں گر بھی گئے مگر گیلے ہوئے بغیر ویسے کے ویسے باہر نکل آئے، اور جو اگر آپ کتاب کو سمجھنے کے پھیر میں پڑے تو پھر یہ دلدل میں اترنے والی بات ہوگی کہ اس میں سے پھر کوئی نکل نہیں پایا۔ پھر یہ پانی آپ کو بھگوتا ہی نہیں ہے، ڈبو بھی دیتا ہے اور مار بھی سکتا ہے، جیسا میرے ابا کے ساتھ ہوا۔

وہ اسی ردی کے ڈھیر میں اوندھے منہ گرا ہوا ملا تھا۔ میں صغراں آپا کے ہاں سے کھانا کھا کر لوٹا اور اسے ڈھونڈھتا ہوا پچھلے کمرے میں آیا تو اسے دیکھ کر مجھے کچھ بھی سمجھنے میں چنداں دشواری نہ ہوئی۔ اس کے باوجود کہ تب میری عمر کچھ زیادہ نہیں تھی، بس یہی کوئی بارہ چودہ برس کا رہا ہوں گا، لیکن جیسے اس بات نے خود کو مجھ پر منکشف ہو جانے دیا کہ ابا مر چکا تھا۔ یہ زندگی میں پہلا بڑا دکھ تھا جس نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ اور مجھے لگا کہ اب تک میں ایک طویل خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد حقیقت کا جو رخ میرے سامنے تھا اس کی تلخی ایک کڑواہٹ کی صورت میں آج بھی مجھے اپنے حلق میں گھلی معلوم ہوتی ہے۔

یوں تو ابا کے زندہ رہتے ہوئے بھی راتیں کبھی مجھے راس نہ آئیں۔ وہ مجھے ردی والے کمرے کے برابر کے کمرے میں بستر پر لٹا کر اور لالٹین بجھا کر چلا جاتا۔ میں کبھی نہ سمجھ سکا کہ وہ راتیں کہاں گزارتا تھا۔ میں اندھیرے کا ڈرا ہوا اسے آواز بھی نہ دے پاتا اور آنکھیں بند کر لیتا حتیٰ کہ نیند مجھے اس خوف کے شکنجے سے نجات دلانے آ پہنچتی لیکن پھر بھی اس کے ہوتے ہوئے مجھے یہ احساس تھپتھپا کر بہلائے رکھتا کہ وہ ہے یہیں کہیں اسی گھر میں۔ اس کی موت کے بعد تو اس احساس کا دلاسہ بھی باقی نہ رہا۔

لوگوں سے میل جول پہلے بھی کہاں تھا' نہ ابا کا نہ میرا۔ ابا کی وفات کے بعد صغراں آپا سے بھی جو روز روز کا ٹاکرا ہوتا تھا' وہ بھی تقریباً ختم ہو گیا۔ میری نیند ہی نہیں، بھوک بھی کم ہوئی تھی۔ ایک دن چھوڑ کر ایک دن میں اس کے گھر کے دروازے کی کنڈی کھڑکاتا۔ وہ میری بلائیں لیتی۔ میرے آگے کھانا پروستی۔ کبھی یہ نہ پوچھتی کہ پچھلے روز میں کیوں نہ آیا۔ ہمیشہ ایسے بات کرتی جیسے ہم کل بھی ملے ہوں۔ مجھے ہمیشہ اس کی یادداشت کی مشین کا کوئی پیچ ڈھیلا معلوم ہوتا۔

ہفتے میں دو ایک بار سہ پہر کو اکثر صرف بوریت کے ہاتھوں عاجز آ کر میں ابا کی سائیکل لے کر نکل جاتا۔ کیریئر سے لگے تھیلے بھر جاتے تو انہیں لے جا کر بوہڑ چوک میں ابا کے دوست چاچا کرم دین کی دکان پر خالی کر دیتا۔ وہ ردی تو لے بغیر کچھ رقم مجھے تھما تا جو کبھی مجھے اپنے مال کی نسبت کم معلوم ہوتی اور کبھی زیادہ۔ لیکن میں نے کبھی چاچا سے دوسری بات نہ کی۔ خاموشی سے جو ملتا اسے جیب میں رکھ لیتا۔ میرے لیے اب اس بات کی اہمیت نہیں رہی تھی کہ کتنی محنت کا کتنا اجر ہو۔ دونوں باتیں ہی بے کار تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے سمجھ میں نہ آتا کہ ان پیسوں کا بہترین مصرف کیا ہو سکتا ہے۔ اور یہ مجھے ہمیشہ اپنے پاس موجود ایک غیر ضروری شے معلوم ہوتے۔

میں بچپن میں بہت نزار جھینپو اور خوف زدہ رہتا تھا اور لڑکے مجھ تضحیک کا نشانہ بناتے۔ ہمیشہ میں نے ان کا اعتماد جیتنے کے لیے ان کو مات دینے کی خواہش کی۔ اسی لیے انہی لڑکوں میں رہا۔ میں اندھیرے سے ڈرتا تھا اور ہمارا گھر ہمیشہ اندھیرے کی بکل مارے رکھتا۔ تب میں سوچتا کہ بڑا ہو کر میں اندھیرے کو زیر کرلوں گا۔ اسی لیے اندھے کونوں میں اپنے لیے پناہ ڈھونڈھتا اور شاید اسی لیے ان کا اسیر ہو گیا۔ اندھیرا مجھے یکجا کرتا اور اجالا تقسیم۔ یہ مجھے الگ کر دیتا اور میرے سائے کو الگ۔

لیکن ایک روز اندھیرے کا بھید مجھ پر کھلا۔ ایک پورے چاند کی رات کو مجھے تاریک منظروں کا ادراک ہوا۔ میں نہیں جان سکا کہ وہ سب کچھ کیا تھا اور وہ کون تھے؟ بس وہ بہت سے تھے، ایک دائرے میں سر جھکائے گھومتے ہوئے جیسے کسی عبادت میں مصروف ہوں۔ اور پھر آہستہ آہستہ آنے والی بہت سی چاندراتوں میں مجھے ساری بات سمجھ میں آئی۔ لیکن نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا کہ کچھ سمجھ میں آچکا ہے اور واقعی کسی شے کے سمجھ میں آجانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ یہ بس میرا احساس تھا جو رفتہ رفتہ پروان چڑھا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کبھی کوئی بات سمجھ میں آنے کے باوجود احاطہ بیان میں نہیں آپاتی۔ آپ بڑا زور مارتے ہیں۔ اس ایک بات کو کہنے کے لیے دنیا بھر کے فلسفے چھان مارتے ہیں لیکن ایک وہی بات نہیں کہی جاتی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔

پورے چاند کی راتوں کو بیان کرنا میرے لیے ایسا ہی ایک مشکل مرحلہ ہے۔ بڑا جمگھٹا ہوتا ہے اور بڑی تیزی سے درخت کے گرداگرد کھنچے حصار میں، جس میں کوئی اپنی مرضی سے داخل ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ میں اسے آختہ کر کے اندر آنے کی اجازت نہ دوں، ہجوم بڑھتا جاتا ہے حتی کہ کبھی مجھے یہ احساس پریشان کرنے لگتا کہ شاید اب میرے لیے اس درخت کی اقلیم میں کوئی جگہ نہیں بچی۔ درست ہے اس اقلیم کے اصل باشندے تو وہی ہیں۔

اس مصروفیت نے میری زندگی کی سبھی دلچسپیوں کو اپنی اوٹ میں کرلیا۔ کسی اور بات کا ہوش ہی کہاں رہا۔ نہ نیند آتی تھی، نہ کھانے کو من کرتا، نہ کپڑے بدلنے کی خواہش ہوتی۔ چہرے پر بالوں کی جھالریں سی لٹکتی تھیں جن کے عقب میں مجھے اپنا آپ چھپا معلوم ہوتا جیسے میں نے کوئی بہروپ دھار رکھا ہو۔ کبھی سرِراہ صغراں آپا سے ملاقات ہو جاتی تو وہ مجھے گھر آ کر کھانا کھانے پر اصرار کرتی۔ مگر میرے انکار پر وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھتی جو مجھے بہت عجیب معلوم ہوتیں۔ جیسے وہ کچھ سمجھنے اور کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

ایک روز جانے کتنے عرصے بعد میں نے صغراں آپا کے گھر کے دروازے کی کنڈی کھڑکائی تو اس کی بیٹی نے مجھے بتایا کہ دو ہفتے پہلے وہ فوت ہو گئی تھی۔ میں نے خاموشی سے یہ خبر سنی اور سر ہلایا۔

''اماں کہتی تھی کہ تم آؤ تو میں تمہیں کھانا دے دیا کروں۔ یہ اس کی آخری خواہش تھی۔'' وہ دروازے میں میرے اندر آنے کے لیے راستہ چھوڑتے ہوئے بولی۔ کون جانتا ہے کس کی کون سی خواہش آخری خواہش ہو۔ کیا واقعی یہ صغراں آپا کی آخری خواہش تھی؟ مجھے کبھی اندازہ نہیں ہو پایا کہ وہ چھوٹی سی بچی جو ابا سے بہت ہلی ہوئی تھی، اتنی بڑی ہو گئی تھی۔ اس کا ایک بھائی بھی تو تھا مجھ سے کچھ بڑا۔ میں نے سوچا اور خالی نظروں سے دروازے کے کھلے پٹ کو دیکھا۔

اس کے بعد میرا صغراں آپا کے گھر، اس محلے سے اور حتی کہ خود اپنے گھر سے ہی جیسے کوئی تعلق باقی نہ رہا۔ نیم کا درخت، پچھلے کمرے میں

پڑے ردی کے ڈھیر، صحن میں دھری ابا کی تین ٹانگوں والی کرسی، کسی بھی شے میں میری دلچسپی باقی نہ رہی۔ جیسے صغراں آپا کی ذات سے ہی ان میں میرے لیے معنویت تھی۔ اس نے مجھے اس سب سے جوڑا ہوا تھا۔ اور اس کے مرنے کے بعد تعلق کا یہ آخری تار بھی ٹوٹ گیا۔

صغراں آپا کی بیٹی نے ایک بار جب میں گھر سے نکل رہا تھا، مجھ اپنے گھر کے دروازے کی اوٹ سے آواز دے کر بلایا اور پھر سے اپنی ماں کی آخری خواہش کا اظہار کیا۔ وہ ایک تابعدار بیٹی تھی۔ لیکن مجھے بھوک نہیں لگتی تھی۔ میں نے اس کی بات بغور سنی اور کچھ دیر خالی نظروں سے اس کے اپنی ماں جیسے چوڑے ماتھے کو تکنے کے بعد سر ہلاتے ہوئے انکار کیا اور مڑ کر ایک سمت ہو لیا۔

بس تبھی ایک روز بستی والوں نے مجھے بہت زدوکوب کیا اور مجھ پر یہ گھناؤنا الزام لگایا کہ میں نے صغراں آپا کے گھر میں داخل ہو کر اس کی بیٹی کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ خود اس لڑکی نے بھی مجھ پر یہ بہتان لگایا۔ مجھے کچھ یاد نہیں ہے کہ کیا ہوا تھا۔ کیا ایسی نیچ اور غیر ضروری حرکت مجھ سے سرزد ہو سکتی تھی۔ لیکن بستی والوں نے مجھے معاف نہیں کیا۔ انہوں نے میرے گھر میں بھی توڑ پھوڑ کی۔ حالانکہ وہاں تھا ہی کیا جسے وہ تباہ کرتے۔

لیکن بستی والوں کو جیسے مجھ سے کچھ کد تھی؟ میں نے اپنے لیے تو ان سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ یہی کہا تھا نا کہ وہ اپنے صحنوں میں نیم کے پیڑ اگائیں۔ آپ گھروں میں رہتے ہیں تو انہیں بھی رہنے کو گھر دیں۔ یا پھر اپنے گھر ان کے لیے خالی کرنے کو تیار ہو جائیں۔ کیا اس بات کو سمجھنا اتنا ہی دشوار تھا۔ لیکن انہوں نے تو میرے ابا کو بھی کبھی معاف نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے طرز زندگی، خیالات جن کے بارے میں اس نے کبھی مجھے قائل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور اس کی مردم بےزار شخصیت سے نالاں تھے۔ وہ کون لوگ تھے۔ میرے ابا نے کبھی مجھے اس بارے میں نہیں بتایا۔ نہ میں نے ہی کبھی استفسار کیا۔

لیکن میرے ابا کو بستی سے نکالے جانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے اس بستی کو آباد کیا تھا۔ بلکہ شاید وہ پہلا فرد تھا جو اس بستی میں داخل ہوا۔ لیکن مجھے کوئی رعایت دینے کی ان کی کوئی مجبوری نہیں تھی۔

ایک دن میں اپنے معمول کے گشت کے بعد لوٹا تو اپنے گھر کے دروازے پر ایک قفل لگا دیکھا۔ مجھے میری ردی اور نیم کا پیڑ تو ساتھ لے جانے کی اجازت دی جانی چاہئے۔ میں نے احتجاج کیا لیکن بے سود۔ خالی ہاتھ بستی سے نکل جانے کے سوا میرے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔

تب پہلی بار میں اپنے گھر سے آگے مشرق کی سمت بڑھا تھا جو میرے لیے ہمیشہ سے انجان علاقہ تھا۔ وہیں جدھر شاید وہ ساری برادری رہتی تھی جس نے آپسی ملی بھگت سے میرے گھر کے دروازے پر قفل لگایا اور اب خاموش تھی۔ اس سمت بڑھتے ہوئے مجھے پہلی بار بستی کے غیر معمولی پھیلاؤ کا ادراک ہوا۔ تنگ اور کھلی ہر طرح کی گلیاں، کئی کئی منزلہ مکان، پرچون اور تھوک ہر طرح کا کاروبار کرنے والے کھلے بازار، ٹریفک کے اژدھام سے نکونک بھری ہوئی سڑکیں، آسمان تک بلند پلازے اور نگاہ کو الجھا دینے والا لوگوں کا ہجوم۔

کبھی کبھار جب ہوا مشرق سے مغرب کی سمت رواں ہوتی تو ٹریفک اور لوگوں کا سرگوشیوں جیسا شور اس بہاؤ کی زد پر بہتا ہوا ہمارے گھر تک بھی آتا تھا۔ لیکن یہ ہماری ہی بستی سے ابھرتا تھا، اس بارے میں تو کبھی میں نے سوچا بھی نہیں۔ مجھے گہرا صدمہ ہوا اپنا گھر چھٹ جانے کا نہیں۔ اس سے بڑھ کر اس حقیقت کے منکشف ہونے کا کہ جس بستی کو میں دنیا کے خاموش اور پرسکون ترین خطوں میں سے ایک شمار کرتا تھا، اس کا چہرہ ہر

طرح کے شور اور ہنگامے کی شکنوں سے بھر چکا اور کیسا کریہہ تھا۔ بستی والے مجھے نہ نکالتے' تو میں خود ہی کہاں زیادہ دیر یہاں ٹکنے والا تھا۔

مجھے یاد نہیں ہے میں کتنا عرصہ چلتا رہا اور میں نے کتنا پینڈا مارا۔ شاید کئی منٹ' یا کئی گھنٹے' یا کئی دن۔ نہ ہی میں یہ جانتا تھا کہ یہ راستہ مجھے کہاں لے جائے گا۔ وہ بستی جہاں میں نے اب تک زندگی گزاری تھی، پیچھے رہ گئی تھی۔ مجھے کچھ بھی وہاں سے ساتھ لانے نہیں دیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ میری یادیں بھی۔ اور مجھے لگا کہ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ ہم سب اپنی نسلوں کی اجتماعی تاریخ کے وارث ہیں۔

میں نے خود پر دنوں کی گرد کو جما رہنے دیا، اور موسموں کے پرندوں کو اپنے وجود کے درخت پر اتر کر چہکنے سے روکا نہیں۔ میں نے اپنے آپ کو فراموش کرنے میں پہلی بار کامیابی حاصل کی اور مجھے لگا کہ میں ہمیشہ بھی چلتا رہوں تو اب کبھی نہیں تھکوں گا۔ یہ ایک عجیب کیفیت تھی۔ یعنی ایک شے جو موجود ہے، مگر ایسا لگے کہ وہ نہیں ہے۔

تب وہ گندے پانی کا نالہ آیا جس کا ذکر میرے ابا بھی کرتا تھا کہ یہ انسانی آبادی کی آخری حد تھی اور اس سے آگے خونخوار جانوروں سے بھرے جنگل تھے جہاں انسانوں کا گزر نہیں تھا۔

میں نے ایک اداس نگاہ پیچھے مڑ کر بستی پر ڈالی۔ وہ فاصلے سے اینٹوں کا ایک پر شور ڈھیر معلوم ہوتی تھی۔ کبھی یہ میری بستی تھی۔ میں نے اس کی رکھوالی میں کتنے ہی برس راتیں جاگ کر گزارے تھے۔ کتنی ہی ابتلاؤں سے تن تنہا لڑا اور انہیں آختہ کیا تھا۔ یہ بستی اب مجھے نوالے میں آئی ہوئی ہڈی کی طرح باہر تھوک رہی تھی۔ اچھا ہے کوئی موسم سدا ایک سا نہیں رہتا۔ دنیا اپنے مدار میں گھومتی ہے جو دائروی ہے اور دائرے کا نہ کوئی آغاز ہوتا ہے نہ انجام۔

دیر تک میں گندے نالے کے کنارے نرم مٹی میں بیٹھا نم آلود ہوا کو اپنے چہرے سے مس کر کے گزرتے محسوس کرتا اور اس کی سرگوشیاں سنتا رہا، اور بہتے ہوئے پانی اور پرے مبہم منظر کو تکتا رہا حتیٰ کہ سورج کی ٹکیہ کہیں کسی افق میں جو میری نظروں سے اوجھل تھا، ڈوب گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں اندھیرا گہرا ہو گیا جیسے رات کو آنے میں بہت عجلت ہو۔ جوں جوں تاریکی بڑھی، میری آنکھوں کے آگے سے روشنی کا غبار چھٹا۔ تبھی مجھے نالے کے پار کا منظر دکھائی دیا۔

ایک کھلا میدان تھا تاحد نگاہ پھیلا اور جھاڑیوں اور خودرو پودوں سے اٹا ہوا اور اس کے بیچوں بیچ نالے سے چند فرلانگ کی دوری پر ایک اونچا ٹیلا تھا سرسبز و شاداب اور ارد گرد ان گنت چھوٹے ٹیلوں کے انبوہ میں گرا ہوا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ نالے پر کوئی پلی نہیں تھی جو مجھے دوسری طرف لے جاتی۔ لیکن میں جانتا تھا وہ ہے یہیں کہیں۔ بظاہر میری نظروں سے اوجھل۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ میں اسے تلاش کر لوں گا اور پھر اس ٹیلے تک جا پہنچوں گا جسے میرا مسکن ہونا تھا اور ایسا مجھے معلوم تھا کیونکہ اس کی چوٹی پر بادلوں کے بہت سے ٹکڑوں کی اوٹ میں دھندلا جانے والے منظر میں بھی مجھے نیم کا بلند قامت پیڑ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

پچھلا دروازہ

سایہ دار درختوں والی گلی کے پار بستی میں ایک روز اس نے ایک بڑے سکول کی عمارت کے باہر بورڈ پر لکھا دیکھا 'ہوا سے باتیں کرنے، پرندوں کی بولیاں سمجھنے اور دلوں کا حال جان لینے کے فن کا ڈپلومہ: داخلہ جاری ہے۔' وہ مدرسے کے دفتر میں گیا تو اُنھوں نے اس کو ایک پیکٹ تھما دیا جو بالکل مفت تھا۔ کوئی داخلہ فیس نہیں تھی۔ نہ ہی اُس کے لیے امتحان دینے ہی کی شرط تھی۔ حاضری کے لیے دن اور وقت کا تعین بھی طالب علم کی صوابدید پر تھا اور کورس بھی وہ خود ہی طے کرتا تھا۔ بہت سی باتیں اس کو داخلہ لینے کے بعد معلوم ہوئیں جیسے یہی کہ سکول کا یونیفارم کوئی نہیں تھا، نہ کلاس جیسی ہی کوئی کلاس تھی۔ استاد ہر وقت دستیاب ہو سکتا تھا۔ طالب علم آتے تھے اور تعلیم لے کر چلے جاتے تھے۔ میں نہیں جانتا وہاں کتنے طالب علم تھے۔ ایک وہ ہوتا اور ایک نسرین جس سے شروع میں تو اتفاقیہ ہی مڈبھیڑ ہوئی لیکن پھر اس میں تسلسل آ گیا کہ دونوں کو اکثر سہ پہر کا وقت ہی موزوں لگتا وہاں آنے کے لیے، کیونکہ اس وقت ماں سو جاتی تھی یا پھر وہ اکثر اوپر کی منزل میں بالکونی میں کھڑی ہو کر ماسی جنتے اور دوسری پڑوسنوں سے جانے کیا ضروری باتیں کرتی رہتی کہ شام کو ابا کے لوٹنے پر ہی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوتا۔

ماں بتاتی تھی کہ وہ بچپن میں بہت شرارتی تھا۔ جو لوگ اس سے بچپن سے واقف نہیں ہیں اور جن میں وہ خود کو بھی شامل کرتا ہے کیونکہ اسے اپنے بچپن کی کم ہی باتیں یاد ہیں تو اُن سب کے لیے ماں کی یہ بات قریب قریب ناقابلِ یقین ہے۔ وہ کہتی ہے کہ نچلا بیٹھنا تو اسے آتا ہی نہیں تھا۔ ہر وقت اُسے اس کا سایہ بن کر اس پر نگاہ رکھنی پڑتی۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اُس کی نظروں سے اوجھل ہوتا، جیسا کہ بقول اُس کے اس کی ہر وقت کوشش بھی ہوتی تو وہ ہر کام چھوڑ چھاڑ اسے ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوتی۔ وہ کہیں کسی کونے میں بیٹھا مٹی کھا رہا ہوتا، بڑی بہن کی گڑیوں کے ٹانکے ادھیڑ کر اُن میں سے روئی نکال رہا ہوتا، ابا کے اوزاروں کے تھیلے یا بہن بھائیوں کی ڈائریوں اور کاپیوں میں تانک جھانک کر رہا ہوتا، یا باورچی خانے میں خفیہ خانوں میں پڑے مصالحوں کے ڈبے الٹ پلٹ دیتا۔

سایہ دار گلی میں کھلنے والا پچھلا دروازہ اس نے اپنے بچپن ہی میں کونوں کھدروں میں اپنی مہم جوئیوں کے دوران دریافت کیا ہوگا۔

اصل میں کوئی اس دروازے کی طرف آتا ہی نہیں تھا۔ کوئی ادھر آتا بھی کیوں۔ باہر بڑے دروازے سے نکل کر ایک چوڑی گلی تھی جو بازار میں کھلتی تھی اور آگے شہر تھا سارے کا سارا، تو کیوں کوئی پچھلے دروازے سے جاتا، اور کیا پتہ یہ تنگ سی گلی کدھر جا نکلتی۔ ان کے شریکے بھی تو بہت تھے۔ کوئی دشمن وہاں تاک لگائے بیٹھا ہو، کوئی گڑھا ہو نیم تاریک گلی میں کسی جگہ اور پھر اچانک کوئی موڑ بھی تو آ سکتا تھا جہاں پہنچ کر یونہی آدمی تذبذب کا شکار ہو جائے کہ یہاں سے آگے بڑھے کہ لوٹ آئے۔ خواہ مخواہ کی الجھن بھری کیفیت۔ وہی باہر کے دروازے والی گلی سب کے لیے موافق تھی، دیکھی بھالی، سب کی جانی پہچانی اور جہاں اور بھی سب لوگ تھے جان پہچان کے۔

لیکن اس کی فطرت میں تجسس کا سانپ ہمیشہ سے کنڈلی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ یونہی سرکتے سرکتے پچھلے دروازے تک چلا جاتا۔ دروازہ کھول کر تنگ گلی میں جھانکتا بھی تھا جہاں نیم تاریکی اس کو گھورتی، ایسی پراسرار نظروں سے کہ وہ سہم جاتا اور دھپ سے دروازہ بھیڑ دیتا۔ یہ پراسرار نظریں اسے خوابوں میں بھی دیکھتی تھیں اور کبھی لگتا کہ اپنی اور بلاتی تھیں۔ اس نے ان کا کبھی کسی سے ذکر نہیں کیا، اپنی ماں سے بھی نہیں جو اس کے خوابوں تک اس کی ہر بات سے واقف تھی۔ اور کیا پتہ اُسے معلوم ہی ہو۔ اس کی کیفیت اُس سے چھپ کہاں پاتی تھی۔ لیکن کیا پتہ۔ اُس نے کبھی اس پر ایسا ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ہمیشہ ویسے ہی ملتی جیسا وہ اُسے دیکھتا اور اُس سے توقع کرتا تھا۔

یہ دروازہ سٹور میں سامان کے پیچھے چھپی دیوار میں موجود تھا۔ سٹور عام طور پر بند ہی رہتا اور چونکہ وہ پچھلے کمرے سے بھی پرے واقع تھا، اُس میں روشنی کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ وہاں زیادہ تر گھر بھر کا غیر ضروری قرار دیا جانے والا سامان پڑا رہتا جس میں سوائے اس کے اور کسی کو دلچسپی نہیں تھی۔ پرانے اور گھسے ہوئے ملبوسات، ناکارہ اور ٹوٹے ہوئے اوزار اور برتن، بے کار فرنیچر، ٹرنکوں کے اوپر دھرے رضائیوں اور کمبلوں کے ڈھیر، پرانے اخبار اور رسالے اور بڑی بہن کے جہیز کے سامان سے بھرا بڑا ٹرنک جس میں اماں ہمیشہ کچھ نہ کچھ ڈالتی ہی رہتی تھی۔ ان سب کے علاوہ بھی چھوٹی بڑی بہت سی چیزیں سٹور میں بھری رہتی تھیں جن کے لیے اس کی دلچسپی اس کی ماں کی ممتا جیسی فراواں اور غیر مختتم تھی۔

گھر کے صدر دروازے سے باہر گلی کافی کشادہ تھی۔ وہیں سب لوگ ایک طرح کی بے قاعدگی، انتشار اور الجھن کے ساتھ چلتے پھرتے، ایک دوسرے سے ٹکراتے، بھڑتے، چیختے اور روتے ہنستے تھے۔ وہیں ساری زندگی تھی جس کا وہ بھی ایک حصہ تھا۔ وہ بچے گلی ڈنڈا سے لے کر کرکٹ، کیری کاٹا اور چھپن چھپائی تک سبھی کھیل کھیلتے۔ گول ڈنڈے پر گلی کی بچیاں ڈالتا ہوا وہ دیر تک اسے نیچے گرنے نہیں دیتا تھا۔ چھپن چھپائی کے کھیل میں بھی اس کو تلاش کرنا کسی کے لیے آسان نہ ہوتا کہ وہ چھپنے کی ہمیشہ نئی سے نئی جگہیں تلاش کر لیتا۔ چاچا دینے کے گھر کی چھت پر کبوتروں کے ڈربے میں جا چھپتا اور یوں خود کو وہاں گم کر لیتا کہ بہت کوشش سے بھی کوئی اس کو وہاں تلاش نہ کر پاتا۔ وہ درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوتا اور گلہری کی طرح اس کے گرد گھومتا کہ تلاش کرنے والوں کی نظریں اس کو پکڑ نہ پاتیں۔ وہ تھڑوں کے عقب میں، دروازے کے پیچھے، گلی کے موڑ پر، مکانوں کی دیواروں کے درمیان موجود تھوں میں، حتیٰ کہ تلاش کرنے والے کی پشت میں کھڑا ہو کر بھی خود کو اُن کی نظروں سے اوجھل کر لیتا تھا۔

لیکن جتنا مزا اسے سٹور میں چھپنے میں آتا اس کا تو کوئی بدل نہیں تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ وہ سٹور میں چھپ گیا اور ماں نے دروازہ مقفل کر لیا اور پھر جب وہ وہاں موجود سامان کی قربت میں رہنے کے بعد اوب جاتا اور گھر والے بھی اسے ہر جگہ تلاش کرنے کے بعد تھک ہار جاتے تو وہ سٹور کا دروازہ اندر سے کھٹکھٹاتا۔ ماں بھاگی بھاگی آتی، ہانپتی ہوئی قفل کھولتی اور دروازے کے پار اسے کھڑا دیکھ کر پہلے تو اسے پیٹتی اور پھر گلے لگا کر رو دیتی۔ وہ بھی رونے لگتا۔

''اس کا کیا بنے گا۔'' وہ ہمیشہ اس کو اپنے نہ ہونے کے بعد کے دنوں میں تنہا تصور کر کے دکھی رہتی۔ جانے وہ ایسا کیوں سوچتی تھی۔ کیوں اسے اپنا آپ ہمیشہ وہاں عارضی محسوس ہوتا۔ وہ اس کو باہری دروازے سے گلی میں جانے کی تلقین کرتی، سبھی ایسا کرتے تھے۔ وہ بھی اُن کا تتبع کرنے میں سہولت محسوس کرتا اور جس کام میں آپ کو سہولت ہو، اسے کرنے کے لیے آپ کو کبھی من نہیں مارنا پڑتا۔ لیکن وہ پھر بھی اوب جاتا اور کچھ نئے کی

جستجو میں پچھلے دروازے کی طرف دھیان کرتا۔

جوں جوں وقت گزرا اور سالوں کی چڑھتی ڈھلتی دھوپ چھاؤں سے واسطہ بڑھا، نئی سمتوں میں جھانکنے کا خوف بھی بجائے بڑھنے کے کم ہوا۔ وہ اس کشش کے آگے بے بس تھا۔ اسی بے بسی کی کیفیت نے اسے اتنا بے خوف کر دیا کہ ایک روز وہ گلی کے اندھیرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دروازہ پار کر گیا۔

سٹور روم کے دروازے کا تالا کھولنا اسے آتا تھا۔ ایک چابی اس نے ایسی تلاش کر لی تھی جس کو تالے میں ڈال کر اور تھوڑا سا سوراخ کے منہ سے باہر رکھ کر پہلے کچھ بائیں اور پھر دائیں ذرا زور سے گھمایا جائے یا پیچ کس تالے میں پھنسا کر دائیں جانب زور سے جھٹکا دیا جائے تو یہ قفل کھولنے کے لیے کافی ہوتا۔ ایک ہی جھٹکے سے نتیجہ موافق نکلتا۔

گلی زیادہ کھلی نہیں تھی۔ شروع میں تو بہت تنگ معلوم ہوئی لیکن جوں جوں اس کی آنکھیں اندھیرے سے شناسا ہوئیں، اسے گلی کی چوڑائی کے بارے میں اسے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ وہ اتنی کھلی تھی جتنی کلب روڈ سے اندر آنے والی چھوٹی سڑک یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ سارے میں گہری خاموشی آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ اور ڈرا رہی تھی۔ حتیٰ کہ اسے اپنے سانس لینے کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ ہوا میں سیلن تھی اور ایسی بو تھی جو پرانی لکڑی کی ہوتی ہے۔ فرش ہموار تھا اور اس کے اندازوں کے قطعی برعکس سیمنٹ کا یا کسی ایسی ہی پختہ شے کا بنا معلوم ہوتا تھا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد اچانک ایک اور بات اسے سمجھ میں آئی کہ اصل میں یہ کسی گھر کا چھت دار گوشہ تھا۔ بلکہ نہیں، یہ گلی ہی تھی مگر چھت دار، اور یہ بات اسے چند قدم مزید چلنے کے بعد ہی معلوم ہوئی کہ یہ دونوں جانب درختوں کی طویل قطاروں کی بہت پھیلی اور آپس میں الجھی اور پھنسی ہوئی شاخوں سے ڈھکی ہوئی تھی کہ روشنی کی ایک کرن بھی پتوں کی چھت سے چھن کر نیچے نہیں آتی تھی۔

ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا تو اس نے آنکھیں پوری کھول کر اپنے ارد گرد دیکھا۔ مدہم سا اجالا ہر سو پھیلا تھا۔ دھوئیں کی مانند اور اسی باریک لہر جیسے پردے کے پرے اس نے اونچے نیچے گھروں سے اٹی بستی کی جھلک دیکھی۔ جانے کیا بات تھی اُس منظر میں کہ اس کی دہشت نے اس کے دل کو اپنی مٹھی میں لے کر بھینچا اور اس کی سسکاری نکل گئی۔ وہ بھول ہی گیا کہ اس نے کیا طے کیا تھا کہ مڑنا نہیں بلکہ الٹے قدموں لوٹنا ہے۔ اس نے دھڑکی لگائی اور اندھا دھند بھاگتا ہوا واپس سٹور میں آیا۔ عجلت میں دروازہ بند کیا اور باہر گلی میں آ کر گہرا سانس لیا جیسے اب تک اسے روکے ہوئے تھا۔ جس بات نے اصل میں اسے دہشت زدہ کیا تھا، وہ یہ تھی کہ اس کے گھر کے عقب میں ایک اور گھر تھا اور اس سے آگے چھوٹا بازار۔ ایسے سایہ دار درختوں والی گلی تو کہیں نہیں تھی۔

شاید یہ پچھلا دروازہ ہی تھا جو اس کے گھر کو محلے کے دوسرے گھروں سے مختلف کرتا۔ ورنہ تو ان میں شاید ہی کوئی ایسی بات ہو، ایک دوسرے سے مختلف۔ ایک ہی جیسا سب کا دروازہ تھا لکڑی کے دو پٹوں والا جن پر اندر اور باہر کی طرف بڑی کڑیوں والی کنڈیاں لگی تھیں، ایک سی بناوٹ تھی ان کی، دو دو تین تین منزلہ جیسے بے قاعدگی سے ان منزلوں کو ایک دوسرے کے اوپر ٹکا دیا گیا ہو، باہر گلی میں نکلے ہوئے لکڑی کے بنے چھجے، ہر کمرے کی ایک ایک کھڑکی گلی یا صحن میں کھلتی ہوئی، باہر بڑے دروازوں سے جڑے ہوئے تھڑے جن کے ساتھ ساتھ گلی میں آڑھی ترچھی لکیروں جیسی

گندے پانی کی کھلی نالیاں تھیں گیلی راکھ جیسے مواد سے ہمہ وقت بھری اور کناروں سے باہر ابل پڑنے کو اتاولی، اور باہری دیواروں پر جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی قلعی۔ اندر کا منظر بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ ایک دالان، لمبی اور تاریک ڈیوڑھی اور پیش دالان سے گزر کر پیچھے رہائش کے کمرے۔

اس نے کبھی نسرین کو نہیں بتایا کہ اس کا تعلق اس کے علاقے سے نہیں تھا۔ اس صاف ستھرے اور شفاف چہروں والے لوگوں کے علاقے کے مقابل اپنے تنگ، پیچدار اور متعفن گلیوں والے علاقے کا ذکر اسے گوارا نہ ہوتا۔ وہ بہت روشن چہرے، چمکدار آنکھوں اور اجلی رنگت والی لڑکی تھی جس میں دوسروں کی توجہ اپنی جانب کھینچ لینے کی غیر معمولی طاقت موجود تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اُس کی آنکھیں دیکھنے والوں کو سکتے میں مبتلا کرنے کے اہل تھیں حالانکہ ان میں کسی طرح کا فسوں طاری کر دینے والا احساس نہیں جھلکتا تھا لیکن اتنی کشادہ اور گہری آنکھیں تھیں اس کی کہ دیکھنے والا ان کی ہیبت سے سانس نہیں لے پاتا تھا۔

ہمیشہ بس عام سی باتیں ان کے درمیان ہوتی تھیں۔ وہ گھر سے کچھ نہ کچھ خاص شے بنوا کر لاتی۔ حالانکہ جب وہ ملتے، وہ وقت نہ دوپہر کے کھانے کا ہوتا، نہ رات کے کھانے کا۔ وہ دونوں سکول کے لان میں بیٹھ جاتے۔ وہ کم کھاتی تھی۔ لیکن جو بھی کچھ وہ بنوا کر لاتی، وہ اکثر اتنا مزیدار ہوتا کہ زیادہ تر وہی اُسے کھاتا۔ اور کبھی اسے لگتا وہ اپنی ضرورت سے کافی زیادہ شاید اسی کے لیے لاتی تھی۔ ایک روز اُس نے اسے ایک قلم بھی دیا جس پر دل کی شبیہہ بنی ہوئی تھی، ایک ایسے دل کی جو پھول جیسا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اُس سے کہا کہ کیا یہ ضروری ہے کہ اس قلم سے وہی کچھ لکھا جائے، جو دل میں ہو تو اس نے ادا سے جواب دیا ”کچھ اور یہ لکھے گا بھی نہیں“

اسے یہ بات بہت عجیب لگی۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ سب کچھ اس سے نہیں لکھا جا سکتا۔ کچھ اور میں کس قلم سے لکھوں۔“

”اپنے قلم سے۔“ اُس نے پھولوں جیسی نازک اور خوشبودار مسکراہٹ اپنے چہرے پر بکھیرتے ہوئے کہا اور پھر جیسے کلی کھل کر پھول بن جائے، اُس کی مسکراہٹ ہنسی میں بدل گئی۔ وہ بھی ہنس دیا۔ لیکن پھر خاموش نظروں سے اُسے تکنے لگا۔ اسے لگا جیسے اس بات میں بھی اس کی تحقیر کا پہلو تھا۔ کیا واقعی۔ بہت دیر تک اسے دیکھنے کے بعد بھی وہ کچھ واضح اندازہ نہیں کر سکا۔

سکول میں وہ جو کچھ سیکھ رہے تھے، وہ حیران کن تھا۔ پتھروں میں چھپے کیڑوں کی آواز تک وہ سننے لگا تھا۔ کوا کائیں کر رہا ہوتا تو وہ سمجھ جاتا یہ بھوکا ہے۔ مہمان کی آمد کی خبر دے کر اصل میں یہ کچھ خوراک کی خواہش کر رہا ہے۔ راتوں کو کوئل بظاہر دکھ بھری آواز میں کوکتی تو وہ اُس خوشی کی چمک کو بھی پا لیتا جو بیوں کوکنے سے اُس کی آواز میں پیدا ہوتی۔ دور و نزدیک سے اسے جانے کن پرندوں کی مدد کی پکار سنائی دیتی، کبھی چیخیں اور سسکاریاں اس کے کانوں تک پہنچتیں اور کبھی ان کے سریلے گیت، جنہیں وہ خود بھی گنگناتا اور تب ڈر کے مارے میں منہ نہ کھولتا کہ کہیں انہیں الفاظ نہ دے دے اور جانے پھر کیا ہو۔

وہ ان تجربات کا ذکر نسرین سے کرتا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہتی۔ ”بس اب تم ان آوازوں کے ہجے کرنا بھی سیکھ لو گے۔“ وہ ہمیشہ اسے کوئی ایسی بات بتاتی جس سے اسے لگتا جیسے وہ اس سے اگلی بات بھی جانتی ہو۔

تبھی ایک روز ماں نے اس سے کہا ”یہ تو کیا اپنی کاپیوں میں الٹی سیدھی باتیں لکھتا اور تصویریں بناتا رہتا ہے۔ کہاں جاتا ہے تو۔ کون

پڑھاتا ہے تجھے یہ پٹیاں۔ تجھے یہ الٹی راہ کس دشمن نے دکھائی۔‘‘میں نہیں جانتا وہ اسے الٹی راہ کیوں کہتی تھی۔

’’تم بھی میرے ساتھ چلو۔ بس ایک دفعہ۔‘‘اس نے الٹا اسی کو ترغیب دی تو وہ پریشان ہونے کے ساتھ ساتھ خوف زدہ بھی ہوگئی۔

’’تیرے باپ کو پتہ چلا تو تیری کھال ادھیڑ دے گا۔ تیرے بھی جاننے والے سنگی ساتھی رشتہ دار۔ سبھی ٹھیک ٹھیک ہیں۔ کیوں الٹی سیدھ میں جاتے ہو۔ اپنے بڑوں کے منہ پر کالک ملتے ہو۔‘‘ماں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ معلوم نہیں وہ اتنی خوف زدہ کیوں تھی؟ اس کی یہ حالت دیکھ کر وہ بھی خوف زدہ ہوگیا۔ معلوم نہیں اب کیا ہو؟ وہ اپنے باپ کے غصے سے بہت ڈرتا تھا۔

اس نے ماں سے کہا وہ ابا کو مت بتائے وہ سب کچھ چھوڑ دے گا۔

’’قسم کھا۔ یہ سب کچھ نہیں کرے گا۔‘‘اس نے قسم بھی کھالی، گو جھوٹی ہی، صرف نسرین کے لیے۔’’میرے سر کی قسم کھا۔‘‘اس نے اس کے سر کی قسم کھالی۔ وہ مطمئن ہوگئی۔

ماں سے کیے ہوئے وعدے کا پاس کرتے ہوئے وہ واقعی کئی دنوں تک خود کو دروازہ پار کرنے سے روکے رہا لیکن آخر کب تک۔ ماں ہر طرح سے اس کی خاطر مدارت کرتی۔ رات کو بستر پر اس کے برابر بیٹھ جاتی اور اس کے بالوں میں سرسوں کے تیل کی مالش کرتی اور جب تک وہ سو نہ جاتا، وہ اپنے خاندان اور خاص طور پر اپنے دادا کے بارے میں جیسے اس کا دل بہلانے کی خاطر ایسی محیر العقول داستانیں سناتی جن پر یقین کرنے پر اس کا دل بالکل نہ مانتا۔’’پھر وہ غائب ہوگئے۔‘‘اس کے بیشتر قصوں کا اختتام ایسے ہی کسی جملے پر ہوتا۔ تب اصل بات اسے سمجھ میں آئی کہ وہ اپنے دادا سے بہت محبت کرتی ہے، اور اب بھی ان کے گدگدی کرنے کے کھیل کو یاد کر کے رو پڑتی ہے، جو وہ تب اس سے کھیلا کرتے تھے جب وہ بہت چھوٹی تھی۔

وہ اکثر خوابوں میں نسرین کو دیکھتا کہ وہ اس کے لیے بہت سا کھانا بنا کر لاتی اور لان میں اکیلی ہی بیٹھی گہری اور خاموش نظروں سے سکول کے گیٹ کو تکا کرتی۔ جوں جوں وقت گزرا نسرین کے لیے اس کی چاہت بڑھی اور آخر یہ بات مان لینے میں اسے کوئی تردد نہ رہا کہ وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔

اپنے اسی جذبے کے اظہار کے لیے وہ پھر سے اس سے ملا تو وہ اس کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھی۔ وہ اس کی توقع کے مطابق اپنی ضرورت سے زیادہ ہی کھانا لائی تھی۔

’’میں جانتی تھی تم ضرور آؤ گے۔‘‘

’’کیسے؟‘‘

’’تم اتنے دن کہاں رہے؟‘‘

’’پہلے بتاؤ تم کیسے جانتی تھی؟‘‘

’’پہلے تم بتاؤ اتنے دن کہاں رہے؟‘‘

''نہیں پہلے تم۔''

''پہلے تم۔''

اور پھر وہ خوشی کے مارے زور زور سے ہنسنے لگی۔ وہ بھی ہنس دیا اور خاموشی سے اسے تکنے لگا۔ 'کیا کبھی میں اس سے اپنے دل کی بات کہہ پاؤں گا۔' اس نے اسے دیکھتے ہوئے سوچا اور خود میں اتنی ہمت پیدا نہ کر پایا کہ اسے سچ کہہ سکے۔

انہوں نے کھانا کھایا۔ اُس نے دور اڑتی ہوئی ایک چیل کی طرف اشارہ کر کے بتایا ''یہ اپنے بچے کے لیے کھانا ڈھونڈنے نکلی ہے اور اتنی بلندی سے ہمارے کھانے پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ جلدی سے کھالو۔''

وہ خاموش رہا۔ وہ جانتا تھا وہ سچ کہہ رہی تھی۔ وہ جھوٹ بول ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کی بہت نازک اور شفاف جلد اُس کا کوئی تاثر چھپا ہی نہیں پاتی تھی۔

''تم نے کتنا پڑھ لیا۔''

''کچھ بھی تو نہیں۔''

وہ یہ لفظ 'جھوٹ' کہتے کہتے رک گیا۔ شاید اُس نے میرے خیالات کو پڑھ لیا۔ بولی ''جتنا پڑھتے جاؤ، زیادہ لگتا ہے کہ کچھ بھی نہیں پڑھا۔'' کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولی ''تم کھوئے ہوؤں کو تلاش کر لیتے ہو۔''

''نہیں۔''

''ادھوری باتوں کو مکمل کر لیتے ہو۔'' اس نے جواب میں بس کندھے اچکا دیے۔ وہ بہت مزے سے سر اٹھا کر بولی ''کیا تم دل کی بات جان لیتے ہو۔''

اس نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں اتنی خاموشی تھی کہ وہ گڑبڑا گیا۔

''کیا تم جان لیتی ہو۔''

''تمہارے دل کی جان سکتی ہوں۔''

''تم بہت خوفناک ہو۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بار بار لفظ 'خوفناک' دہراتی اور ہنسنے لگتی۔

جدا ہوتے ہوئے پہلی بار اس کا دل ڈوبا اور اس کے قدموں نے جیسے مڑنے سے انکار کر دیا۔ اور تب پہلے دن وہ جیسا وہاں گیا تھا، ویسا واپس نہ آیا، بہت کچھ اس کا وہیں رہ گیا، نسرین کے پاس۔

وہ اسے کھوؤں ہوؤں کو شناخت کرنے کے اصول بتاتی۔ ادھوری باتوں کو کیسے مکمل کرنا چاہیے اور دلوں کی بات کو کیسے پایا جا سکتا ہے۔

''بہت آسان ہے۔ چہرے پڑھنا آ جائیں تو پھر کچھ مشکل نہیں رہتا۔''

''مجھ سے نہیں پڑھے جاتے۔''

''مجھ سے بھی نہیں پڑھے جاتے تھے۔سب سے پہلی شرط ہے کہ ایسا چاہو۔چہروں کو یوں دیکھو۔جیسے اب دیکھتے ہو،ویسے نہیں۔بس یوں دیکھو جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہو۔پہلی بار کی حیرت اور تجسس ختم نہ ہو تو سب کچھ بندہ سیکھ لیتا ہے۔''

''تم نے اتنے دن میں اتنا کچھ سیکھ لیا۔''

''اتنے دنوں میں نہیں۔ہمیشہ سے۔اچھا چھوڑو ہم کیسی بوجھل باتیں کرنے لگے۔''

''بوجھل تو نہیں ہیں۔مجھے اچھی لگتی ہیں۔''

اور اکثر ایسے موقعوں پر وہ اس سے اس کے گھر کے بارے میں پوچھتی۔اُسے بہت تجسس تھا کہ وہ اُسے اپنے بارے میں بتائے،حتیٰ کہ وہ اس کی ماں سے،اس کے بہن بھائیوں سے ملنے کی بہت مشتاق تھی۔وہ ہمیشہ بات ٹال دیتا۔

وہ بھی اس بارے میں زیادہ کرید نہ کرتی۔وہ شاید اسے اس کی دلچسپی کا موضوع نہ سمجھتی تھی۔حالانکہ ایسا نہیں تھا۔وہ دلوں کو پڑھ لیتی تھی تو کیا وہ اتنا نہیں جانتی تھی کہ وہ اُس سے محبت کرنے لگا تھا اور شاید اسی لیے اُس سے ویسے بے تکلفانہ سوال نہ کر پاتا تھا۔شاید وہ ایسا ہی سمجھتی ہو،ظاہر نہ کرتی ہو۔انتظار کرتی ہو،اُس لمحے کا جب ان کے درمیان یہ مہین سا پردہ تکلف کا اٹھ جائے،وہ ایک دوسرے کو جان لیں اور ایک دوسرے کو بسر کرنا شروع کردیں۔

وہ تو اسے بسر کرتا تھا اور اسے ہمیشہ اپنے ساتھ محسوس کرتا۔وہ اس سے جدا ہو کر بھی اس سے دور نہ ہو پاتی۔اس کے خیالوں میں رہتی بلکہ اسے ہر جگہ دکھائی دیتی،کبھی آئینے میں اور کبھی کسی دوسرے کے چہرے میں۔کبھی خوابوں میں اور کبھی یونہی اس کے ہیولے کے قریب ہونے کا بہت واضح احساس ہوتا۔

اس کا جی اب گھر میں بالکل نہ لگتا۔بلکہ کسی بھی بات میں نہ لگتا۔بالکل عجیب کیفیت تھی۔ماں اور بہن بھائیوں کے پاس بیٹھنا،انور کے ساتھ گلی کے سرے پر تھڑے پر محفل جمانا اور گلیوں میں مٹرگشت کرنا،کسی بھی بات کی حب نہ رہی تھی،سوائے نسرین کی حُب کے۔معلوم نہیں وہ اس کے بارے میں ایسا محسوس کرتی تھی یا نہیں۔اسے اُس کو صاف کہہ دینا چاہیے۔کبھی دل میں خیال آتا۔لیکن اُس جیسی اجلی لڑکی کو اپنے خیالات کے اوچھاڑ سے میلا کرنے کو اس کا جی نہ کرتا۔کیا پتہ تھوڑی بہت جو بے تکلفی ان کے درمیان تھی،وہ ایسا کہہ دینے کے بعد باقی رہے،نہ رہے۔

ایک دن ماں نے اس سے پوچھا ''تم نے وہ سب کچھ چھوڑ دیا کہ نہیں۔''

''نہیں''اس نے جھوٹ بولنا چاہا پہلی بار بہت دقت ہوئی۔اتنا چھوٹا سا تو جھوٹ تھا اور وہ بھی ماں سے۔لیکن اسے اپنے آپ سے لڑنا پڑا،اور تب پہلی بار اس نے خود میں نسرین کو سماتے ہوئے محسوس کیا۔جیسے وہ نہیں،نسرین بول رہی ہو۔صاف صاف بالکل سچ''نہیں۔''نسرین نے کہا اور ماں بھونچکا سی اس کی صورت دیکھا کی۔

''میں نے تجھے منع کیا تھا۔۔۔میرے یار ربا یہ بات کسی اور سے مت کہنا۔''وہ بالکل ہی روہانسی ہوگئی۔اُس کا کرب اُس کی آنکھوں سے

آنسو بن کر چھلکنے لگا۔ اُس نے خوف سے اپنا منہ اور آنکھیں بھینچ لیں۔

''مجھے اُس لڑکی سے محبت ہے۔'' نسرین پھر سے بولی، بے خوف، بے لحاظ۔

''تجھے کمی ہے کسی شے کی۔ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے۔ کیوں اپنی زندگی رولتا ہے۔ تجھے کھو دینے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔۔۔۔'' ماں بولتی چلی گئی جیسے کسی ہیجان میں۔ پھر خاموش ہو کر اس کی صورت تکنے لگی۔ وہ ہار گئی تھی۔ بیٹے کی ضد کے آگے ہمیشہ کی طرح اس نے ہتھیار پھینک دیئے تھے۔ اس نے بیٹے کی آنکھوں میں ایسی چمک دیکھی تھی جس نے اسے بھی چندھیا دیا۔

''تو اپنی پڑھائی تو مکمل کر۔''

''میں پڑھ رہا ہوں ماں۔ ساتھ ساتھ پڑھائی بھی ہو رہی ہے۔ تو فکر نہ کر۔''

''ایسی پڑھائی کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''تجھے کیا پتہ میں کیا پڑھ رہا ہوں۔ تو سُن تو سہی۔''

''مجھے مت سنا۔ چپ رہ۔ تیری مت ماری گئی ہے۔ اُسے پڑھائی کہتا ہے۔ اور جو تجھے میں نے پڑھایا تھا، تیرے باپ نے اور تیرے سکول نے پڑھایا تھا، وہ تو نے بھلا دیا۔ ایسا جادو ہو گیا ہے تجھ پر۔'' ماں اب غصے میں تھی۔

اس نے سوچ لیا کہ بحث فضول تھی۔ ماں بولتی رہی۔ اس کے کسی جواب کی توقع، اسے کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے اُسے سنتا رہا۔

ایک دن اس نے دیکھا نسرین نے سفید دودھیا پتھر کی انگوٹھی پہن رکھی تھی جو اُسے اُس کے استاد نے دی تھی۔ اس نے نہیں پوچھا کہ کیوں اسے یہ انگوٹھی دی گئی تھی۔ انگوٹھی بہت خوبصورت تھی اور نسرین کے ہاتھ میں تو اور بھی بھلی لگ رہی تھی۔ پتھر کی چمک نے جیسے اُس کے پورے وجود کو منور کر دیا تھا۔ اس کا دل ٹوٹ گیا اور اس نے اُسے مبارک باد بھی نہیں دی۔

اگلے کئی دن اس کا دل بہت بوجھل رہا اور جیسے طبیعت بجھ گئی۔ جیسے بخار ختم ہونے کے بعد منہ کا ذائقہ پھیکا سا ہو جاتا ہے، ایسی ہی اس کی کیفیت تھی۔ انور ملنے آتا تو وہ سر درد کا بہانہ کر دیتا۔ کہیں بھی جانا حتیٰ کہ سکول جانا بھی اس نے ترک کر دیا۔ اپنے کمرے میں پڑا رہتا یا شام کو باہر کے دروازے سے نکل کر پرے 'پاتھی گراؤنڈ' میں چلا جاتا جہاں درختوں نے کتنے ہی بڑے رقبے کو ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ کسی درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا اور پہروں خالی ذہن کے ساتھ گھاس پر پرندوں کی آوت جاوت کو ملاحظہ کرتا۔

وہاں سے نکلتا تو ادھر ادھر بھٹکتا لائبریری میں جا کر بیٹھ جاتا اور ہر زبان اور ہر نوع کے رسالے اور کتابیں پڑھ ڈالتا۔ لیکن کتابوں میں بھی اب کوئی بات اس کو اپنی جانب متوجہ نہ کرتی۔ یوں لگتا جیسے ان میں لکھی باتیں یا تو وہ جانتا تھا یا ان کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا، یا پھر یہ گمراہ کن اور جھوٹ پر مبنی تھیں۔ ایسی ہی کیفیت اب دوسروں کی باتیں اور سوچیں بھی اس پر طاری کرتی تھیں۔ اس کے ابا نے اس سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ جانے کیوں۔ وہ بہت مصروف رہتا تھا اور بہت تھکا ہوا گھر آنے لگا تھا۔ ماں کو گھر کے جھمیلوں نے یوں الجھا دیا تھا کہ وہ اسے اس کے حال پر

چھوڑ کر جیسے اسے بھول ہی گئی تھی۔ چھوٹا بھائی اور بڑی بہن اسے بٹر بٹر تکتے جیسے انہیں کچھ ہو گیا ہو یا اس کو کچھ ہو گیا تھا۔

وہ نہیں جانتا کتنا وقت یونہی گزر گیا۔ لیکن اسے اتنا معلوم تھا یہ جو کچھ بھی تھا، فرار یا غصہ ہمیشہ باقی رہنے کے لیے نہیں تھا۔ اسے ختم ہونا تھا اور آخر ایسا ہوا۔ ایک دن وہیں گراؤنڈ میں بیٹھے ہوئے اچانک وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے فیصلہ کیا کہ "یہ سب کچھ ہمیشہ یونہی نہیں رہ سکتا۔"

اُس دن جب ماں ہمسائی کے ساتھ منگل بازار میں سستی سبزیاں اور دالیں خریدنے گئی، اس نے سٹور کے دروازے کا تالا توڑا۔ کورس کی کتابیں اٹھائیں اور سٹور روم سے ہو کر کبھی واپس نہ آنے کے ارادے کے ساتھ پچھلی گلی میں نکل گیا۔

اسے اپنا استاد کلاس روم میں ملا۔ وہ اس کو دیکھ کر بولا "تو تم آ گئے۔" وہ خاموش رہا۔ اس نے جیب سے سفید پتھر کا بنا ہوا ایک قلم اور ایک انگوٹھی نکال کر اس کی طرف بڑھائی اور بولا "کورس مکمل کرنے پر میری طرف سے انعام۔" اس نے بغور قلم کو دیکھا۔ وہ اسی قیمتی پتھر سے بنا معلوم ہوتا تھا جس کے نگینے والی انگوٹھی نسرین نے ایک روز اسے دکھائی تھی۔

استاد بولا "اپنا کورس کچھ ادھورا چھوڑ کر ہی لوٹ جاتے ہیں اور پھر اپنے دروازوں کو مقفل کر لیتے ہیں۔ تم ایسا مت کرنا۔ اور اب لوٹ جاؤ کہ یہی قاعدہ ہے۔" اس اسے لگا استاد کا چہرہ ہولے ہولے ہر سو پھیلے اجالے میں تحلیل ہونے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پانی کی تہہ دبیز ہو رہی تھی۔

اس نے قلم سے اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر نسرین کا نام لکھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو کا قطرہ ٹپک کر ہتھیلی کے وسط میں آن گرا۔ بس تبھی اس کو اپنے دل پر طمانیت کی گہری ٹھنڈک سی اترتی محسوس ہوئی جیسے سردیوں میں کبھی کبھار دھند کی دبیز چادر شہر کی گلیوں اور بازاروں میں اترتی ہے، بہت خاموشی کے ساتھ دھیرے دھیرے ہر شے کو اپنے لپیٹ میں لیتی ہوئی، ہر شے کو، اسے اور اس کی کہیں بھی لوٹنے کی بچی کھچی خواہش کو اور خود نسرین کے لیے اس کی محبت کے پرحدت جذبے کو بھی۔

(ختم شد)